www.iqbalkalmati.blogspot.com

نفسانے

قدرت اللہ شہاب

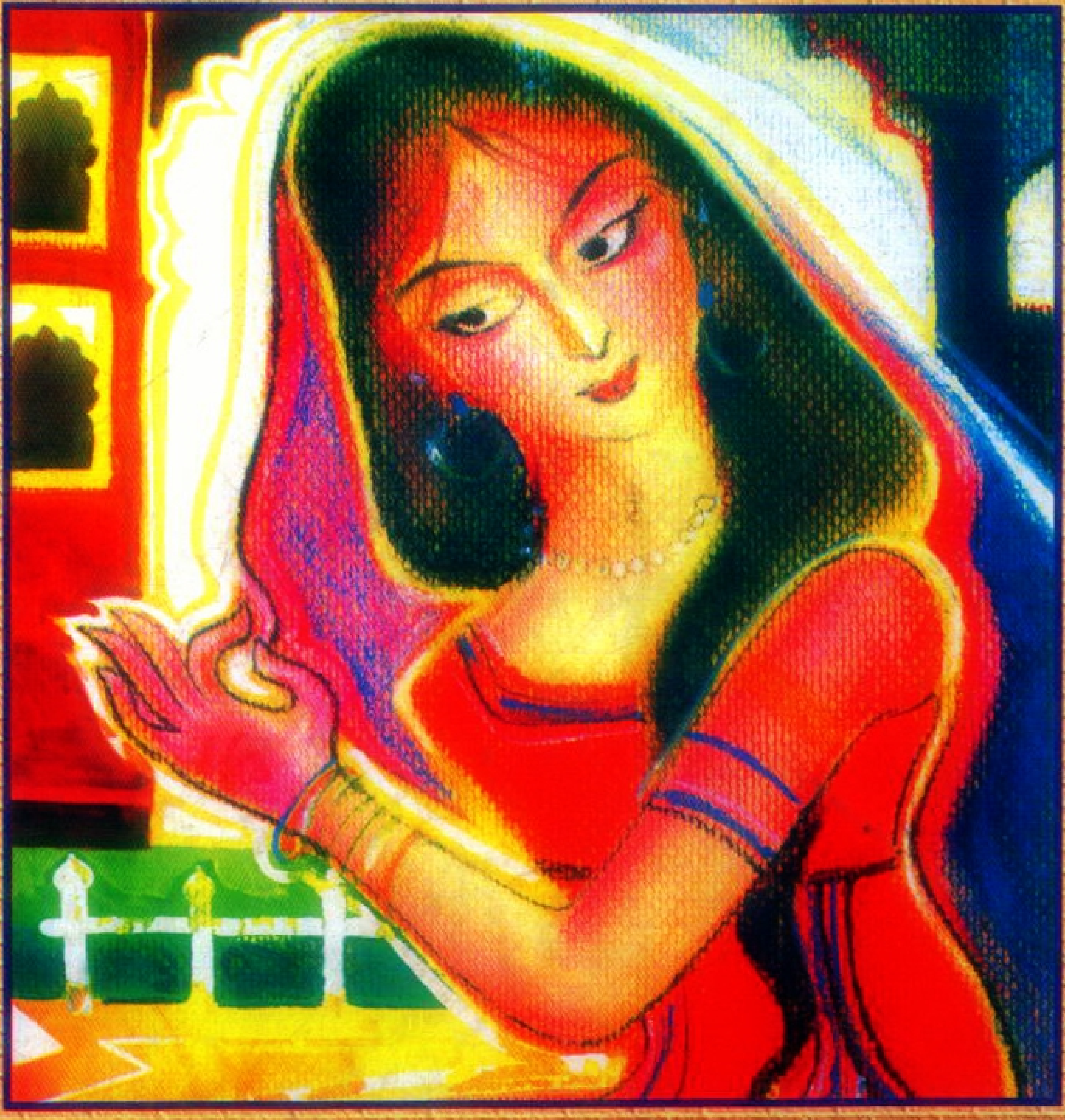

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

لے دے	5
غریب خانہ	11
شلوار	22
جگ جگ	29
کٹی ہے رات تو----	37
سب کا مالک	46
ماما	59
جال	65
آپا	73
تلاش	80
دو رنگا	90
جلترنگ	99
ڈاگی	106
تین تارے	113
پہلی تنخواہ	119
صنم پلکیت	126
سٹینوگرافر	133

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(اسی کو دیباچہ سمجھ لیجئے!)

لے دے

لینے دینے کے بیوپار میں یا تو بنئے کو مہارت ہے یا ملا اور پنڈت کو دونوں کے خون میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کی رمق ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عموماً درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازل سے موجزن ہے، اسے نہ لینے سے سروکار ہے نہ دینے سے البتہ تُو تُو مَیں مَیں والی گردان میں جتنی بامحاورہ گُلفشانیاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غالباً ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہوا جب اماں حوّا اور بادا آدم بیک بنی و دو گوش جنّت کے باغیچوں سے گول کیئے گئے۔ میاں ابلیس کے ہونٹوں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی، جب اس کے ٹھکرائے ہوئے خاکی مسجود کی زبان پہلی بار لذتِ ممنوعہ سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد گرجا گھر کی زبان میں، جب آسمانی رحمتوں کے دروازے دوبارہ کھل گئے، اور بادا آدم کے بیٹوں اور اماں حوّا کی بیٹیوں نے جوق در جوق اس دنیائے فانی کو نوازنا شروع کیا، تو گویا طوفانِ نوح کے نام 'ضرورت ہے' کا پہلا اشتہار تیار ہونے لگا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یا تخت یا تختہ۔ سر سے کفن باندھ کر------ وغیرہ وغیرہ۔ قسم کی نازک خیالیاں عملی جامہ پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو روائتی لے دے کا چرچا ہے، اس نے ابال کھا کر ایک طرف تو ملک گیری کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوس کو بھڑکایا، اور دوسری طرف ذہنی بغاوت کے بیج بوئے۔ پہلی صورت میں سکندر اعظم اور ہٹلر کی جماعت کے بزرگ پیدا ہوئے، دوسری صورت میں۔۔۔۔۔۔ خیر، آج کل کے افسانہ نویس ہی سہی! لیکن یہ طے ہے، کہ روزمرہ کی عامیانہ زندگی میں لے دے کی نشونما میں جو ترقی ہوئی اس کے عملی پہلو کا سہرا بلا شرکتِ غیرے دکان کے سر ہے: خواہ وہ اناج کی منڈی میں ہو، یا کوٹھوں کے بازار میں۔۔۔ اور اس کے علمی پہلو کی تربیت میں بی بھٹیارن کا جو ہاتھ ہے اُسے تسلیم نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ دروغ برگردن راوی۔ حکایت ہے کہ سرائے میں مسافروں کی بانٹ چھانٹ میں جب کبھی ہمسایہ بھٹیارنوں میں ذرا شدید قسم کا تبادلہ خیالات ہونے لگتا تھا، تو انہوں نے تُو تُو مَیں مَیں کی فرسودہ ترکیبوں سے اُکتا کر ایک تازہ سلیقۂ دشنام یہ ایجاد کیا کہ میرا مسافر تیرے مسافر کو۔۔۔۔۔۔ طویلے کی بلا بندر کے سر! لیکن کھلی ڈھلی گالی گلوچ کے مقابلہ میں یہ بلاواسطہ طرزِ بیان زیادہ مقبول ہوا۔ چنانچہ اب بہ نفسِ نفیس لڑنے کی بجائے نواب صاحب بٹیر، اور شاعر حضرات شعر لڑانے لگے۔ خدا جنّت نصیب کرے، جن دنوں مشاعروں کی دھوم دھام تھی، ادب کا معیار اپنے جوبن پر تھا۔ نو عروس کی طرح سج دھج کر محفل جمی ہوئی ہے۔ متانت، سنجیدگی، وقار کا غلبہ ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش دوزانوں بیٹھے ہیں۔ چہروں پر سکوت ہے، لیکن آنکھوں میں صبر شکن بیتابیاں تڑپ رہی ہیں، کہ نکلو تو میدان میں ہم بھی دیکھیں کتنے پانی میں ہو۔! بارے شمع کو گردش ہوئی ایک تلاطم سا اُٹھا، اور کسی نے گرج کر مطلع داغا۔ اب کیا تھا، مصرع سے مصرع ٹکرانے لگا۔ ردیف سے ردیف اُلجھی، قافیے سے قافیہ بھڑا، مضمون سے مضمون لڑنے لگا۔ اور پلک جھپکنے میں گویا پانی پت کا تاریخی میدان سمٹ کر اس ننھی سی مجلس میں اُمڈ آیا۔ نظروں کے تیر تان تان کر چھوڑے گئے۔ پلکوں کی شمشیر نے برق کی طرح کوند کر دادِ شجاعت دی کالی زلفیں زہرناک ناگنیں بن کر لہرائیں۔ گھنگھریالے بال زنجیریں بن کر پھیلے۔ کچھ بچارے قید ہوئے۔ کوئی بسمل ہوا۔ کسی نے آہ کی۔

کوئی واہ واہ کا نعرہ لگا کر تڑپنے لگا اور جب موذن نے اللہ اکبر کی بانگ دی، تو شمع گل ہوئی سب نے اُٹھ کر دامن جھاڑے، اور خراماں خراماں حاصلِ مشاعرہ گنگناتے ہوئے اپنی راہ لگے۔

لیکن ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں! رفتہ رفتہ ہوا کا رخ بدلنے گا۔ بزرگوں کو شکایت ہے، کہ جوں جوں شاعری کا جوہر کمیاب ہوتا گیا، شاعروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعروں کی جگہ قوالیوں کا رنگ جما، میرزا سودا کے غنچہ اور قلمدان کی جگہ رسالوں نے سنبھالی اور غالب و ذوق کی تیکھی تیکھی نوک جھونک نے تنقیدی مقالوں کا بہروپ لیا۔ تنقید کو ذرا ثقیل قسم کی لے دے ہی سمجھئے۔ لیکن جب وہ پھٹے ہوئے لفافوں یا کھلی چٹھیوں کی صورت میں تقسیم ہونے لگے، تو یوں نظر آتا ہے جیسے وہ صیغۂ تذکیر و تانیث کی رُو سے لے دے کا اسم مخنث ہو!

مثلاً دو شاعر دست و گریبان ہوگئے۔

ایک نے ہانک لگائی۔ "ہونہہ، ذرا اپنا الف مقصورہ تو دیکھو! کمر ہے کہ ٹیڑھی، سینہ پچکا ہوا، جیسے دمے کا مریض کھانس رہا ہو!"

دوسرے صاحب جھنجھنائے "اخاہ، مینڈکی کو بھی زکام ہوا؟ ذرا اپنی حائے حطّی کا پیٹ تو سنبھالو۔ جیسے اپھارے کا مارا ہوا بنیا ڈکاریں لے رہا ہو!"۔

تیسرے صاحب نے اس معرکہ آرائی کو دیکھا تو ان کی رگِ تنقید بھی پھڑکی اور وہ اللہ کا نام لے کر دھم سے دونوں کے درمیان کود پڑے۔ "اجی صاحب کہاں کا الف مقصورہ اور کہاں کی حائے حطّی۔ ذرا اس خاکسار کا حق، تو ملاحظہ فرمایئے۔ واللہ کس بلا کا سڈول ہے۔ اور نقطوں کی گولائی۔۔۔ خدا کی قسم قشقے ہیں قشقے۔۔۔۔۔۔"

اس کشاکش میں اب ج کا اپریشن ہوتے ہوتے وہ تو بچارے لد گئے۔ لیکن اب تینوں طرف سے ہونے لگا کہ میرا شعر تیرے شعر کو۔۔۔۔۔۔ میری نظم تیری نظم کو۔۔۔۔۔۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ لیکن فی زمانہ اس ادبی دھینگا مشتی کا سب سے بڑا اکھاڑہ وہ ادب ہے جسے سہواً یا اتفاقاً ترقی پسند کہا جاتا ہے تخیل اور بیان کی اس نئی روش نے زندگی کے تاریک اور گمنام پہلوؤں کو اجاگر کیا، اور مستقبل کے لئے نئی نئی شاہراہوں کا نشان دکھایا۔ اس رہنمائی میں ماضی کے جمود اور حال کے اضطراب میں ایک بے پناہ ٹکر لازمی تھی۔ چنانچہ نئے ادب کے دوش بدوش نئے ادیب پر بھی بے اختیار کیچڑ اچھلا---- اجی صاحب روسی پراپیگنڈا ہے، روسی! لٹریچر نہ ہوا ہسپتال ہوا، کہ جدھر دیکھو کھانسی، بخار، دمہ، سل، دردِ گردہ! عشق ہے تو نرسوں کے ساتھ، راز و نیاز ہوتا ہے تو اپریشن کے وارڈ میں۔ واللہ دہلی کے دواخانے بھی شرما جائیں! گویا دنیا بھر میں مزدور کی ٹوکری، سڑک کوٹنے والے انجن، اور اُونچی اُونچی چمنیوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔ چھوکری ہے تو اس کے سینہ پر کچی ناشپاتیاں پک رہی ہیں۔ عورت ہے تو پامال۔ بہن ہے تو کسی بھوکے ننگے آرٹسٹ کے ساتھ بھاگنے پر تلی ہوئی۔ جوان بیٹی باغ کے مالی کو دیکھ کر فٹ کھا جاتی ہے۔ گیارہ بچوں کی ماں بارھویں ننھے کی فکر میں ہے۔ اور پھر ہسٹریا کا دورہ! بیویوں کو ہسٹریا، بھابیوں کو ہسٹریا--- شاید بچارا ادیب بھی اسی دورے میں مبتلا ہے! اس کی بات بات میں جنسی بھوک کے انگارے تڑپتے ہیں۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، تو اس کا ماڈل ننگا ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو اس کا عریاں تخیل جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ قافیہ ردیف کی قید سے بھی آزادی چاہتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے، تو اس کے جوان چھوکرے گرسنہ بھیڑیوں کی طرح منہ پھاڑے جوان لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور جنسی بندشوں سے گھبرائی ہوئی عورتیں فِٹ پر فِٹ کھاتی ہیں----- پیاسے ہونٹ ڈھیلی شلواریں۔ پوشیدہ امراض---روسی پراپیگنڈا ہے، روسی!

جواب ملتا ہے، کہ حضرت آپ نے وہ شلوار ہی کیوں پہنی جو آسانی سے ڈھلک جائے! زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تہذیب کی کینچلی بدل گئی۔

اخلاق کا معیار از سرِ نو تعمیر ہوا۔ باغیچوں کی جگہ کارخانے بن گئے۔ کوئل کی جگہ ریڈیو نغمہ سرائی کرنے لگے۔ تخیل کی جگہ ہوائی جہاز پرواز کرنے لگے۔ بالا خانوں کی جگہ کلب گھر نے سنبھال لی۔ حرم سرا کا رتبہ ہوٹلوں نے ہتھیا لیا۔ اور آپ ہیں کہ "بلبل کی انکھڑیوں میں رگِ گل کی پھانس" تلاش فرما رہے ہیں! قبلہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر؟ برتھ کنٹرول کا زمانہ، اور عورت کو یوں با ادب با ملاحظہ ہاتھ لگانا جیسے نماز کی تسبیح ہو!------ اور پھر اس جنسی بھوک کی لت کس کو نہیں؟ آپ کی ادبی کائنات میں عورت کی ذات کے سوا اور ہی کیا؟ آپ کے چمن میں پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ وہ کسی معشوق رعنا کی سیج پر بچھائے جائیں۔ بلبل کی نغمہ سرائی میں آپ کی چہیتی مغنیہ کا سرود چھلکتا ہے---اور پھر یہ وصل اور فراق کا جھگڑا کیا ہے؟ محبوب کے کوچہ میں یہ ہائے وائے کیسی؟ آپ وہاں سر کے بل جاتے ہیں۔ آنکھوں کا فرش بچھاتے ہیں۔ دیوار سے سر پھوڑتے ہیں۔ دربان کی خوشامد ہوتی ہے۔ وصل کا شربت چھنتا ہے اور آپ خالی بوتلیں اٹھائے مارے مارے پھرتے ہیں---اگر سچ مچ آپ کے دل اور دماغ پر اس عورت کو پا لینے کا بھوت سوار نہیں ہے۔ جو بالاخانے کی کھڑکی میں بن ٹھن کر بیٹھی ہے یا جو حرم سرا کی چار دیواری میں ازل سے قید ہے، تو آپ کے طلسمی رنگ محل بے معنی نظر آتے ہیں۔ اور ادب کے میدان میں (بقول آپ کے) آپ کی شہسواری بیکار سی تفریح معلوم ہوتی ہے۔ عورت!---وہ آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اس کا قصیدہ ہے۔ آپ کی نظموں پر وہ سوار ہے۔ وہ آپ کے تخیل میں تیرتی ہے۔ اور جب معاشرت کے اصولوں سے مجبور ہو کر وہ کھلم کھلا آپ کے ہتھے نہیں چڑھتی، تو آپ ایک اور حرکت سرزد فرماتے ہیں۔ یعنی آپ کی توجہ ساقی گلفام کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ نوخیز ساقی جس کی مسیں مشکل سے بھیگی ہوں------ جس کے چہرے پر سبزے کا ہلکا سا آغاز ہو----- قبلہ، کیا لینا، کیا دینا ادب ترقی پسند ہو یا غیر ترقی پسند رومان کا گہوارہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتا ہے۔ آپ اپنے رومان کو زندگی سے نوچ کر ایک دماغی خلا میں لے جاتے ہیں۔ نئے ادیب کا رومان گلیوں کے نکڑ پر ہوتا ہے، مزدوروں کی بارکوں میں، پہاڑی چشموں کے پاس، میونسپل کمیٹی کے نل پر، ریل کے ڈبے میں، گھر کی چاردیواری کے اندر ------ کیونکہ اس کے آگے اور پیچھے زندگی کی انتھک مشین چلتی رہتی ہے۔ بناتی ہوئی، بگاڑتی ہوئی، کچلتی ہوئی --- آپ کے عاشق اور معشوق جنوں اور پریوں کی بستی سے اترتے ہیں، یا محلوں کی سیج پر اُگتے ہیں یا خوابوں کی ٹھنڈی دنیا میں بستے ہیں۔ اس کا عاشق دن بھر دفتر میں کام کرتا ہے یا کارخانے کی چمنیاں صاف کرتا ہے یا ہوٹل میں جاکر شراب پیتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایک شریف زادی ہوتی ہے، کہ جس کے تخیّل کو دبی ہوئی خواہشوں نے آوارہ کر دیا ہو۔ یا ایک مایوس جوانی کہ جس کی قسمت ایک بہت بوڑھے یا بہت موٹے، یا انجوڑ سے مرد کے ساتھ ٹانک دی ہو ---- یا پھر وہ ایک سستی سی بجھتی ہوئی شمع ہوتی ہے۔ جسے خود آپ کے اصول ہر روز نئی محفل میں بھڑکنے کے لئے مجبور کرتے ہوں ---- آپ اپنے ہیرو اور ہیروئن کی شادی رچاکر انہیں حجلہ عروسی میں دھکیل دیتے ہیں، اور واپس آکر نو مہینے کے بعد بچّے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب حجلہ عروسی کے پردے گراکر واپس نہیں آجاتا۔ وہ خلوت خانوں کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور دبے پاؤں پسِ پردہ کے رموز ٹٹولتا ہے۔ بارہا اس نے دیکھا کہ نودمیدہ غنچے بیدردی کے ساتھ کسی پھٹی پرانی، بوسیدہ جھولی میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ ایک ہلدی اور نمک کا سوداگر کسی روشن دماغ حسّاس لڑکی کو گود میں لئے بازار کے بھاؤ سنا رہا ہے۔ کوئی آرٹسٹ نوجوان ایک بچّے پیدا کرنے والی مشین کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے ------ یہ زندگی کی ستم ظریفیاں ہیں۔ آپ انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب ان کا پیچھا کرتا ہے ----

لیکن چھوڑیئے جناب، کہاں کی بات کہاں جا پڑی۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں!

غریب خانہ

"تو چلی جا غریب خانے" ہری بلبھ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ "یہاں سسک سسک کر کسے دکھا رہی ہے سالی؟"

"شام تک پھر سوچ لے۔" گماشتہ نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مونچھیں سنبھال کر دوبارہ کہا۔ "تیرے باپ کی جگہ ہوں سالی۔ پتھر کے بھگوان تو بھوگ مانگتے ہیں۔ ہمارا بھگوان ساری عمر کے لئے نہال کر دے، ہاں!" اور جاتے جاتے ہری بلبھ نے چہرے کی بناوٹ سے ہنسنے کی کوشش کی۔ کچی پکی مونچھوں میں اس کے تین کالے کالے، پیلے پیلے دانت ڈگمگاتے سے نظر آئے جیسے دھوئیں سے گھٹی ہوئی بھڑیں اپنے چھتے میں دم توڑ رہی ہوں۔

کامنی کو ان سسکتی ہوئی بھڑوں میں بڑا زہر نظر آتا تھا۔ اور وہ ہری بلبھ گماشتہ کی ہنسی دیکھ کر سہم جاتی تھی۔ جب وہ باپو سے لگان کا تقاضا کرنے آتا۔ تو یہی گھناؤنی مسکراہٹ ان گندی گندی گالیوں کا راستہ صاف کرتی تھی جنہیں سن کر کامنی کی ماں شرم کے بوجھ سے جھکتی جاتی اور باپو زور زور سے کھانس کر گماشتہ کی گرجتی ہوئی آواز کو دھیما کرنے کی کوشش کرتا۔ بیگار کے روز تو وہ مونچھیں اور بھی جھکتیں اور بھی گرتیں اور اس کی بھڑیں کچھ زیادہ پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ دم توڑنے کی کوشش کرتیں۔ کیونکہ ہری بلبھ کے ہاتھ چھتے کی جگہ لاٹھی کے ساتھ زیادہ مصروف رہتے ---- اور پھر ایک دن جب کامنی نے دیکھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ اس کی چھوٹی سے جھونپڑی میں اتنا بڑا خلا ہو گیا ہے۔ جتنا کہ آسمان کی افقی وسعتوں کو سمیٹ کر بھی نہ ہو سکے۔ تو اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹے ہوئے جالے کے ایک تار سے لٹکی ہوئی مکڑی کی طرح اس بے پایاں خلا میں لٹک رہی ہے۔ اکیلی بے سہارا بے آواز------ اور اس وقت ہری بلبھ گماشتہ نے زبان گھما گھما کر اپنے منہ میں سوئی ہوئی بھڑوں کو جھنجھلایا، اور کامنی کے ہاتھ میں بھگوان کے سہارے کی ڈور تھما دی۔۔ "رونے سے کیا ہو گا پگلی؟ باپو گیا، میّا گئی، بھیّا گیا۔ سبھی جاتے ہیں، کامنی۔ کون رہا ہے، اور کون رہے گا۔ سدا نام بھگوان کا---چل، تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ سوشیل ٹھاکر کے پاس رکھوا دوں گا سالی، پتھر کے بھگوان تو بھوگ مانگتے ہیں۔ ہمارا بھگوان------"

اکیلی بے سہارا، بے آواز---کامنی نے سہارے کی ڈور کو تھام لیا سوشیل ٹھاکر بھگوان تھے۔ انہوں نے کھینچا۔ ہری بلبھ گماشتہ کے بھگوان نہیں، آٹھ گاؤں کے سِکّہ بند، سندیافتہ اَن داتا---انہوں نے ڈور کو کھینچا--- جھٹکے سے، پیار سے، غصّے سے، ہولے ہولے، تیز تیز۔ وہ دیوداسی تھی، کھنچتی آئی، آنکھیں موندے، بھرم لگائے پجارن کی طرح جو من کی لو سے موہ مایا کا جال کاٹتی ہوئی بڑھتی جائے۔۔---مایا کا جال! آنکھوں پر پردہ ہی تو ہے، موہ کا۔مایا کا---اور بچپن میں کامنی کے کان کتنی ہی بار اینٹھے گئے تھے، اور اس کی بانہوں پر شہتوت کی چھڑیاں سٹاک سٹاک برسا کرتی تھیں۔ جب وہ پاٹھ شالہ میں گیتا کے اشلوک بھول جایا کرتی تھی! پنڈت جی کی لمبی سی چھڑی، ہوا میں دائرے بنا کر گھوما کرتی---آنکھوں پر پردہ ہے مورکھ، موہ کا، مایا کا، پردہ اٹھاؤ اور درشن پایا---پنڈت جی اونچی اونچی لَے میں پڑھاتے۔ اور پھر چھڑی ہاتھ سے رکھ کر اپنی ران کھجلانے لگتے۔ اور پوپلے منہ سے گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح گایا کرتے---گھونگھٹ کے پٹ کھول ری، تو ہے پیا ملیں گے------ گھونگھٹ۔ ہاں رے۔ ہاں جی۔ گھونگھٹ کے پٹ کھول ری------

اکیلی، بے سہارا، بے آواز---وہ ڈور میں مچھلی کی طرح اٹکی ہوئی جا رہی تھی۔ بنسی کا دوسرا سرا بھگوان کے ہاتھ میں تھا۔ ہری بلبھ گماشتہ کے بھگوان آٹھ گاؤں کے بھگوان، کامنی کے بھگوان---اور ایک روز جو زور کا جھٹکا لگا۔ تو جیسے سارے جال ٹوٹ گئے ہوں۔ سارے پردے ہٹ گئے ہوں------ کیونکہ اس نے دیکھا تو سوشیل ٹھاکر ننگے کھڑے تھے---بالکل ننگے، جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے نکل کر آئے ہوں۔ بڑبڑاتے ہوئے، بگڑے بھینسے کی طرح ڈکارتے ہوئے، اور اُن کے منہ سے ایک تیز تیز سڑاندھ نکل رہی تھی۔ جو ہر سانس کے ساتھ کمرے میں منتشر ہوتی جاتی تھی۔ کامنی گھبرائی، تڑپی اور ایک جھٹکے سے اپنے سہارے کا پھندا توڑ تاڑ کر بھاگ گئی--- چھی چھی---اُسے گھن آ رہی تھی، جیسے آسمان کے کسی سوراخ سے اس نے دیوتاؤں کو گندگی کھاتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ اور جھونپڑی میں آتے ہی سب سے پہلے اس نے تلسی کا پودا کٹاک سے توڑ ڈالا۔ اور چبوترے پر رکھے ہوئے بھگوان کو ہوا میں زور سے گھما کر پچھواڑے کے تالاب میں دے مارا---غٹ،غٹ،غٹ، تالاب میں بلبلے اُٹھے، اور ٹوٹ گئے۔ کامنی کو سکون سا ہوا، کہ اب مایا کے پردے پر گدلے پانی کا ایک موٹا سا غلاف بھی چڑھ گیا ہے۔

"میں نے کہا تو کتیا ہے، کتیا۔" ہری بلبھ گماشتہ نے لاٹھی زمین پر مار کے کہا۔ چار دن سے بھوکی بلک رہی ہے، تجھے کاٹتا ہے سوشیل ٹھاکر کا گھر؟ چل اُٹھ، پھر سے لگوا دوں گا وہاں---باپ کی جگہ ہوں سالی۔

"نہیں چاچا۔" کامنی نے منت سے کہا۔ "میں وہاں نہ جاؤں گی۔"

"تو پھر کہاں جائے گی بڑی رانی؟"

"غریب خانے۔"

"تو چلی جا غریب خانے۔" ہری بلبھ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ "یہاں سسک سسک کر کسے دکھا رہی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سالی؟"

کامنی کو ڈر بھی لگا، اور غصہ بھی آیا میں تو غریب خانے جاؤں گی ہی، لیکن یہ کون ہے سالی کا باپ بیچ میں آنے والا؟ اس نے سوچا۔۔۔اور جب ہری بلیہہ گماشتہ اپنے چہرے کی بناوٹ سے ہنسنے کی کوشش کرتا ہوا چلا گیا، تو کامنی نے اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں بسنے والے لامحدود خلا پر ایک ویران سی نظر ڈالی۔ اور کسی اندرونی ہچکچاہٹ سے مغلوب ہو کر اس نے تلسی کے ٹوٹے ہوئے پودے کو بڑے زور سے جھنجوڑا، اور سوکھی ہوئی پتیوں کے ذرّے ہوا میں اڑاتی ہوئی غریب خانے کی طرف چل پڑی۔

غریب خانہ پانچ کوس تھا۔ تین کوس چل کر رقمن کی کٹیا آئی۔ "اری کمنو۔ کہاں چلی؟" رقمن نے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پوچھا۔

"غریب خانے۔"

"پرچی لائی؟"

"نہیں تو کیسی پرچی، رُقی؟"

"اری، تو نہیں جانتی؟ سوشیل ٹھاکر یونین کے سرپنچ ہیں نا؟ ان کی پرچی بنا داخل کیسے ہوگی؟"

"دیکھوں گی شاید ہو جاؤں۔" کامنی نے مایوسیوں کا سیلاب دبا کر کہا۔

"ہاں۔ بابو اچھے ہیں۔ ہو ہی جاؤ گی۔" رقمن نے کامنی کے گالوں پر چٹکی لیکر آنکھ ماری۔ "ذرا بال سنوارتی جانا"

اور پھر رقمن نے ایک لال لال خوبصورت کمبل کی تہہ اٹھا کر کریم کریکر بسکٹوں کا ایک ڈبہ نکالا۔ بہت تھک گئی ہو۔۔۔لو یہ بسکٹ کھالو۔"

"تیرے پاس یہ بسکٹ کہاں سے آئے، رقی؟ اور یہ کمبل؟"

"پگلی! کال تو چاولوں کا ہے۔ بسکٹوں کا کال تھوڑی ہے۔" رقمن نے مسکرا کر دھوتی کا پلّو سینے پر کر لیا۔ "یہ جو سڑک بنانے والے صاحب کا تنبو ہے۔۔۔ کچھ سیدھا سا تو نام ہے۔۔۔۔۔ لُوتھر، ہاں ہاں۔ لُوتھر صاحب۔ کیا

بتاؤں کمنو۔۔۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔۔۔" رقمن آنکھیں گھما کر اپنے ہاتھ چومنے لگی۔

خِی خِی خِی۔۔۔۔کامنی کو رقمن کے بدن سے گھِن آنے لگی۔ کریم کریکر کا جو ٹکڑا اس کے مُنہ میں تھا۔ لئی سی بن کر حلق میں چپک گیا۔ اس نے پانی کے دو لمبے لمبے گھونٹ پئے اور وہاں سے چل دی۔

رُقی۔ کمبل۔ بسکٹ، اور سڑک بنانے والے صاحب کا تنبُو۔۔۔۔۔ وہ ان مکڑی کے جالوں میں اُلجھتی اُلجھاتی چلتی رہی اور جب غریب خانے کے گیٹ کیپر نے اسے ڈانٹ کر روکا، تو وہ گویا کسی گہری نیند سے جاگ اُٹھی۔

"میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟ کہاں مُنہ اُٹھائے جا رہی ہو؟" گیٹ کیپر چلّا اٹھا۔

"میں غریب خانے میں رہوں گی، بابو۔" کامنی نے سہم کر کہا۔

"پرچی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو جاؤ۔ پرچی لاو۔ پُور ہوس نہ ہوا، باوا کا لنگر خانہ ہوا کہ جو آیا سو۔۔۔۔۔"

"اماں چھوڑو یار۔" گلزار حسین سقّے نے کامنی کے چہرے پر نظریں گاڑ کے کہا۔ "بابو تک پہنچنے تو دو۔ سب پرچی ورچی نکل آئے گی، یار میرے۔۔۔۔"

"ہاں۔" بھوپن باورچی نتھنے پھلا کر بولا۔ جیسے بگھاری ہوئی دال سونگھ رہا ہو۔ "مال بُرا نہیں۔"

"تازہ پھُٹی ہے۔" سکھو مہتر نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

غریب خانہ کے سپرنٹنڈنٹ نے چشمہ اُتار کر کامنی کو خوب غور سے دیکھا۔ آگے، پیچھے، نیچے، اُوپر۔۔۔۔اور پھر کرسی پر بیٹھ کر مسکرائے۔ "او کے۔ ڈاکٹر تم بھی ٹسٹ کر لو"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر نے بھی ٹیسٹ کیا۔ "فٹ ہے!" دونوں مسکرائے۔ اور جب کامنی نے غریب خانے میں قدم رکھا تو اس کی دائیں پسلیوں میں ڈاکٹر کے انگوٹھے کے دباؤ سے ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا جی چاہا کہ بھاگ جائے۔ لیکن پھر اس کی نظر بینا پر پڑی، جو مٹی کا ایک گندہ سا پیالہ اُٹھائے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔۔۔۔ "تم آ گئی ہو، کامنی؟" بینا کے مُنہ پر خوشی کا جوار بھاٹا سا آیا کیونکہ چار مہینے پہلے وہ بھی اسی طرح آئی تھی۔ لیکن اس کے پاس پرچی تھی۔ جو سوشیل ٹھاکر نے دی تھی۔ بینا کے ہاتھ میں بھی ہری بلبھ گماشتہ نے سہارے کی ایک ڈور لا کر دے دی تھی۔ لیکن وہ ایک سیدھی سی لڑکی تھی۔ بے حس نہیں۔ ایک سیدھی سی عام سی لڑکی جس کے شعوری احساسات پیٹ کی ٹکر کھا کر چُور ہو گئے تھے۔۔۔۔ اور جب سہارے کی ڈور اسے کھینچتی ہوئی مجاز کے پردوں کے پیچھے لے گئی۔ تو بچاری کو کچھ بھی عجیب نظر نہ آیا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں سوشیل ٹھاکر نے کبھی دیوتا کا روپ نہیں لیا تھا۔ "تُو نے سوشیل ٹھاکر سے پرچی نہ مانگی، کامنی؟" اس نے پوچھا۔ "وہ تو جھٹ سے دے دیتے۔ آؤ! ادھر ہمارے پاس بیٹھو۔"

کامنی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے گردن مروڑ کر اُسے ایک اندھیرے غار میں دھکیل دیا ہے، جس میں بھیانک بھیانک، ڈراؤنی ڈراؤنی روحیں ایک دوسرے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ غریب خانے میں چار سو پچاس روحیں تھیں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں والے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ سسکتے ہوئے آدمی۔۔۔۔ سُوکھی ہوئی لٹکتی ہوئی چھاتیوں والی، رینگنے والی بوڑھی عورتیں جن کے بال ان کی ہڈیوں کی طرح سوکھ کر جھڑ گئے تھے۔۔۔۔ بےشمار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے پیٹ پھُولے ہوئے تھے اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، ان کے دلوں میں ایک نامعلوم ارتعاش تھا۔ ایک چھپی ہوئی کپکپاہٹ جو ڈراؤنا خواب دیکھ کر رگ رگ میں لرزنے لگتی ہے۔ لیکن زبان پر نہیں آتی۔۔۔۔ ان کی معصوم آنکھوں میں ایک اچٹتی ہوئی سی وحشت

تھی۔ سہمی ہوئی سی ویرانیاں جو ان کی زندگی کے راستے میں خون آشام بھیڑیوں کی طرح دانت نکالے کھڑی تھیں۔ بچوں کو دیکھ کر کامنی کا دل تڑپ اُٹھا اور اس کا جی چاہا کہ وہ ان تمام معصوم مجسّموں کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے، اور بھینچ بھینچ کر کہے۔۔۔۔ میری جان، تم کائنات کی ویرانیوں میں اڑتے ہوئے آوارہ ذرّے ہو۔ جن کو نہ زمین نگلتی ہے نہ آسمان سنبھالتا ہے۔ تم آ کر میرے سینے سے چمٹ جاؤ۔۔۔۔۔

ان کے علاوہ پُوَر ہوس میں آٹھ دس جوان عورتیں تھیں۔ جن کے کپڑے ذرا صاف تھے، چہروں پر رونق، آنکھوں میں چمک۔۔۔۔ جیسے اجڑے ہوئے قبرستان میں کلیوں کے بوٹے اُگے ہوئے ہوں! ان میں بیناؔ تھی، مالوؔ، بسنتیؔ، رحمنؔ، فروزاںؔ، شامولیؔ۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی بدنصیب جوانیاں جن کا اُجڑا ہوا حُسن ان چڑھاوے کے پھولوں کی طرح تھا جو قبر کے سرہانے پڑے پڑے مرجھا گئے ہوں۔۔۔۔ شاید اس چاردیواری میں آنے سے پہلے ہی ان کے سنبھالے ہوئے آبگینے چھلک چکے تھے۔ شاید وہ کسی ازلی انصاف کے ترازو میں تُل چکی تھیں۔ اور قدرت کے کسی درندانہ قانون نے ان کے جسم کو چار چھٹانک چاول کی قیمت پر چکا دیا تھا۔۔۔۔ لیکن جب وہ غریب خانہ میں داخل ہو گئیں، تو گویا ان کی زندگی کے چور دروازے اپنے آپ کھل گئے۔ اور اب ان راستوں سے نئی نئی دھوتیاں، خوشبودار صابن کی ٹکیاں، سسکتے ہوئے، رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے حصوں سے چرائے ہوئے گلوکوس ڈی کے ڈبے، وٹامن بی کے قرص، کاڈلِور آئل، سہمے ہوئے بچوں کے مُنہ سے چھینی ہوئی دال، کبھی دودھ، کبھی سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کی چائے، کبھی ڈاکٹر کی الماریوں کے پیچھے رکھے ہوئے مصری کے کوزے۔۔۔۔۔ ان کھلے ہوئے دروازوں سے یہ چھوٹی چھوٹی عشرتیں ان کی زندگی میں داخل ہو رہی تھیں۔۔۔۔ اور چھوٹے چھوٹے رومان بھی! جو رات کی تاریکی میں غریب خانے کی فضا پر زبردستی چھا جانے کی کوشش کرتے۔ جس طرح قبرستان کے احاطے میں دلہا دلہن کی برات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھڑی ہو کر باجے بجانے لگے---اور شاید یہی وجہ تھی، کہ رات کے وقت جب سسکتے ہوئے کراہتے ہوئے، ڈھانچے زندگی کے لق و دق صحرا میں آخری کنارے کا کھوج لگانے کے لئے تڑپنے لگتے، اور جب ننھے ننھے بچے خواب میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی جھنجھناتی ہوئی کھوپڑیاں دیکھ کر چیخ چیخ اُٹھتے، تو اس وقت یکایک سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنے ادھورے رجسٹر کا فارم پُر کرنا یاد آتا۔ اور وہ بینا کو اپنے دفتر میں بلا لیتے۔ ڈاکٹر کو گلوکوس کے ڈبے اور کونین کی شیشیاں الماری میں سجانے کے لئے فروزاں کی فوری ضرورت محسوس ہوتی۔ گلزار حسین سقّے کے مشکیزے میں سرِشام ہی چھید ہو جاتے اور بسنتی کو ٹانکے لگانے کے لئے جانا ہی ہوتا۔ مالُو اپنا آنچل سنبھال کر بھوپن باورچی کے برتن منجھوانے جاتی۔ سکھو مہتر کا ٹوٹا ہوا جھاڑو رحمن کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ اور شامولی کو غریب خانے کی حفاظت اتنی پیاری ہوتی کہ وہ آدھی آدھی رات گئے گیٹ کیپر کو ہشیار کرنے جایا کرتی---اور اسی طرح غریب خانے کی بہت سی بیناؤں، بسنتیوں اور شامولیوں نے اپنے اپنے سہارے کی لڑیاں تھام رکھی تھیں۔ اور ان کی زندگی کے چور دروازوں سے ابلی ہوئی دال اور چاول کے ساتھ ساتھ نئی نئی دھوتیاں، صابن کی ٹکیاں، اور گلوکوس، ڈی، کی مٹھاس بھی رس رس کر آنے لگی تھی!

"کیا سوچتی ہو، کامنی؟۔" بینا نے اسے ہلا کر کہا۔ "بابو پوچھتے ہیں رجسٹر میں نام لکھوا دیا تو نے؟"

کامنی چونکی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب عینک ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "داخلہ پھر ہو جائے گا۔ بچاری بھوکی ہے۔ لیجاؤ لنگر میں بینا۔ ٹائم ہو گیا ہے۔"

گلزار حسین سقّے نے مسکرا کر ایک مٹی کی تھالی اور پیالہ اُسے دیا۔

کامنی کو لنگر میں جاتے ہی ایک دھکا لگا۔ ایک مدھم سے چراغ کی روشنی میں غریب خانے کی ساری آبادی مٹی کے پیالوں اور تھالیوں پر جھکی ہوئی سپڑ سپڑ کھا

رہی تھی، بچوں کے غول آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور نیم جان ہڈیوں کے ڈھانچے کسی برقی قوت سے بیدار ہو کر چیلوں کی طرح بھوپن باورچی پر جھپٹ رہے تھے۔

"ادھر آ جاؤ، اس طرف۔" بھوپن باورچی نے سر اُٹھا کر کامنی کو آواز دی۔ اور اپنے کندھے کا رومال اُتار کر پاس والی جگہ جھاڑنے لگا۔

کامنی چلتے ہوئے لرزتی تھی، اس کے بدن میں چھوٹے چھوٹے سانپ سے رینگ رہے تھے۔ کبھی کسی بڑھیا کی سوکھی ہوئی چھاتی اس کے ہاتھوں سے چھو جاتی، اور کبھی کوئی ہانپتا ہوا بوڑھا بے تحاشا اُس کے کندھوں پر گر کے دم سیدھا کرنے لگتا۔ اور پھر اچانک اُس کے پاؤں پر جیسے اُبلتا ہوا پانی گر پڑا ہو۔ اور ایک خوفناک سی بڑھیا نے اس کی ناک پکڑ کر مُنہ پر زور سے چانٹا مارا۔ اندھی ہے رانڈ؟ "بڑھیا کڑکی۔ "دال گرا دی باپ کی کتیا نے-----" اور جب تک کامنی بھوپن باورچی کے پاس نہ جا بیٹھی۔ وہ بڑھیا غضبناک آنکھوں سے اس کا پیچھا کرتی رہی۔

بھوپن نے اُسے بہت سے چاول دیئے بہت سی دال، اور جب وہ کھا چکی تو اس نے ٹوکرے کے نیچے سے دودھ کا پیالہ بڑھایا۔ اور کہا "اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چپکے چپکے پی لینا۔" اور پھر گلوکوس ڈی کی ایک مٹھی بھی کاغذ میں لپیٹ کر کامنی کو دی۔ "یہ شکّر ہے۔" بھوپن نے ہونٹوں سے چُس چُس کرتے ہوئے کہا "ولائتی ہے ولائتی!" اور اپنا ہاتھ پونچھنے کے لئے کامنی کی پیٹھ پر رگڑنے لگا۔

"اری اِدھر سے جا۔" بینا نے کامنی کو دھکیل کر کہا۔ "کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا۔ یہ کلموئے کسی کو کھاتے ہوئے دیکھ کر سہارتے نہیں۔" بینا نے سپڑ سپڑ کرتی ہوئی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن کامنی کے نکلنے سے پہلے ہی بچوں کے ایک غولِ بیابانی نے اسے گھیر لیا، اور۔ "دُودھ۔ دُودھ" کے ہلّے کے ساتھ اس کی ٹانگوں، باہوں، کمر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کندھوں سے لپٹ گئے۔ اسی ریل پیل میں ایک گرتے ہوئے بڈھے نے اس کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر غٹ غٹ پی لیا! "حرامی" بھوپن پھنکارا کر اٹھا۔۔۔گلزار حسین سقے نے لاٹھی پھینکی۔ سکھو مہتر جھاڑو چلانے لگا اور سپرنٹنڈنٹ صاحب نے لاتوں، مکّوں، طمانچوں کی بارش برسائی۔ سُور کے بچے۔ بدتمیز۔ حرامزادے۔۔۔۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب گلفشانی کرنے لگے، اور پھر اندھیرے میں جاکر انہوں نے کامنی کی کمر میں ہاتھ ڈالا، اور پچکار کر بولے۔ "کچھ نہیں، گوری، دودھ اور بھی بہت ہے۔ بینا، لے آنا اِسے میرے دفتر میں۔ فارم بھی تو بھرنا ہے۔" وہ مسکرائے۔ بینا بھی مسکرائی، اور کامنی کو چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں ایسا نظر آنے لگا۔ جیسے وہ دونوں اس کے سامنے کھڑے ننگے ہوگئے ہوں۔۔۔۔۔۔

رات کے سناٹے میں جس وقت ڈاکٹر کی الماریوں کو مددگار کی ضرورت ہوئی اور گلزار حسین سقے کے مشکیزے میں چھید نظر آنے لگے جن کو بسنتی کے سوا کوئی دوسرا مرمت نہ کر سکتا تھا، اور سپرنٹنڈنٹ صاحب رجسٹر کا ایک نیا فارم بھرنے کے لئے بے تاب ہونے لگے۔۔۔اس وقت کامنی اپنے گاؤں کی پگڈنڈی کی طرف تیز تیز بھاگی جا رہی تھی۔ اُسے غریب خانے کی چاردیواری سے ڈر لگنے لگا تھا اور یوں نظر آتا تھا کہ بہت سے ننگے بھوت اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر ناچ رہے ہیں۔ اب فطرت کی وسیع فضا میں آ کر اس نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا اور سوچنے لگی۔ کہ معلوم نہیں سہارے کی ہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سیاہ وحشی سا حیوان کیوں کھڑا ہوتا ہے اور۔۔۔۔۔۔ یکایک وہ کسی چیز سے ٹکرائی اور مُنہ کے بل گر پڑی۔

"اندھا۔" ایک آدمی تڑپ کر اُٹھا۔ اور جب اس نے محسوس کیا کہ اس پر گرنے والی چیز عورت ہے، تو اسی گرجدار آواز سے گرامر درست کر کے بولا۔

"اندھی!"

"کیا ہے؟" دوسرے آدمی نے لیٹے ہی لیٹے خوابیدہ آواز میں پوچھا۔

"چھوکری ہے" پہلے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر وثوق سے کہا۔ "لے جاؤ صاحب کے تنبو میں۔ شام سے مُنہ پھلائے بیٹھا ہے سالا" تیسرا بولا۔

صبح کے دھندلکے میں کامنی پھر فطرت کی وسیع فضا میں سانس لیتی ہوئی جا رہی تھی۔ ہولے ہولے اُبھرتے ہوئے سورج دیوتا کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی تھرتھرا رہی تھی۔ زندگی کی شاہراہ میں سہارے کی ڈوریوں کا تانا بانا الجھا ہوا تھا۔ اور اس میں کالے کالے، سفید سفید، ننگے ننگے بھگوان بھولے بھٹکے راہیوں کی دست گیری کے لئے ہاتھ پھیلائے بیٹھے تھے۔ کامنی کے دل میں نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ اُسے ساری دنیا سے گھِن آنے لگی۔۔۔ چھی چھی چھی فطرت کی وسیع فضا سے سورج کی اوّلین ناپاک کرنوں سے اپنے بدن کی دکھتی ہوئی رگ رگ سے لال کمبل سے جو اس کے کندھے پر جلتی ہوئی چتا کے شعلے کی طرح دہک رہا تھا، بسکٹوں کے ڈبے سے جو وہ ہاتھ میں بھینچتی ہوئی جا رہی تھی۔۔۔اور جب رُکمن نے اسے واپس آتے دیکھا، تو وہ ہنسی۔ "آگئی نا واپس میں نے کہا تھا، پرچی لے جاؤ۔"

پھر اس نے دیکھا کہ کامنی کے پاس تو لال کمبل ہے، اور کریم کریکر بسکٹوں کا ڈبہ بھی۔ رُکمن نے تڑپ کر اپنا ہاتھ مُنہ پر رکھ لیا۔ جیسے کامنی نے اس کے مُنہ پر کھینچ کے جوتی مار دی ہو۔۔۔۔"رانڈ" وہ نتھنے پھلا کر غصے سے چلائی "میرے ساتھ چُل کھیلتی ہے، کنجری؟ غریب خانے کا نام بدنام، اور جاتی ہے اپنے یار لوتھر کے پاس۔۔۔۔۔۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شلوار

"شلوار؟" رشیدہ نے میز پر مکا مار کے کہا۔ "کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے؟ نہ سمجھ، نہ بوجھ بس ہلادی بالشت بھر کی زبان، اور لگے افلاطون کے کان کاٹنے۔۔۔۔۔"

نسیم بے توجہی سے مسکرایا۔ اس نے سگرٹ کا دھواں گھما گھما کر مُنہ سے نکالا۔ "وہ دیکھو بھابی، میں نے کیا اچھے 'رِنگ' بنائے ہیں!؟"

"اُلو۔" رشیدہ غصّے سے بولی۔ "میں شلوار کی بات کرتی ہوں اور تم 'رِنگ' بنا بنا کر۔۔۔۔۔"

"اچھا، بابا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟"

"اپنے سر سے باندھ کر ناچو، اور کیا؟ بدتمیز کہیں کے۔ جو مُنہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقعہ نہ لحاظ، نہ شرم۔ اگر وہ برامان جائے تو؟"

"خدا کی قسم!" نسیم شرارت سے مسکرایا۔ "بڑا مزا آئے! میں نے اسی کو ستانے کے لئے تو کہا تھا، بھابی!"

"بس یہی کرتب سیکھنا تم۔ جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہو توں توں عقل گھٹتی جاتی ہے۔۔۔۔۔"

اور پھر یکایک نسیم کو خیال آیا، کہ شاید جمیلہ نے سچ مچ بُرا مان لیا ہو! آہا ضرور چڑ گئی ہوگی! اسی لئے تو وہ سر جھکائے تن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گال ضرور لال ہوگئے ہوں گے، اور اس کے کانوں کے پیچھے نادم سی گرماہٹ پھیلی

ہوگی۔ جبھی تو وہ سرسراتی ہوئی نکل بھاگی۔ ورنہ وہ اسے دیکھ کر ٹھہرتی، رُکتی، جھجکتی، جاتے ہوئے قدم قدم پر گھومتی اور جیسے بچاری کو یک لخت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آگئی ہوں۔۔۔۔ "بھابی میری اُون ضرور بھیجنا۔" "ہاں بھابی دیکھیو، ہلکے عنابی رنگ کی ہو"۔۔۔۔ اوئی اللہ، بھابھی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دکھائی ہی نہیں۔۔۔۔" کبھی چوڑیاں دیکھنے کبھی سلائیاں اٹھانے، کبھی جھوٹ موٹ کی باتیں دہرانے وہ جاتی، لوٹتی، گھومتی اور نہ جانے کیوں ایک میٹھا سے ارتعاش اس کے سینے میں کپکپانے لگتا، اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سی تمتماہٹ دہک اُٹھتی اور اس کی آنکھیں۔۔۔۔ یااللہ، اس کی بھیگی بھیگی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہوا میں تیرتیں۔۔۔۔ اور نسیم کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سگرٹ کے دھوئیں کی طرح رِنگ بناتا ہوا اُبل رہا ہے، اور وہ چور چور سی آنکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔

"جمیلہ ضرور چڑ گئی ہوگی! شبنم کی طرح حسّاس تو ہے۔۔۔۔ بھلا چڑتی کیوں نہ؟" نسیم نے بھابھی کو جھنجھوڑا۔ "میں کہتا ہوں بھابی، اس نے بُرا تو مانا ہوگا!"

"چل بھٹیارہ۔" بھابی نے میز پر سے چائے کی پیالیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔ "شرم تو نہیں آئی ہوگی، ابھی؟"

"شرم؟ ارے واہ!" بھابھی کی جھنجلاہٹ پر نسیم ہنسنے لگا۔۔۔۔ اور ہنستا گیا یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو ہنسے ہی جاتا۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی سفید سفید دانتوں کی بتیسی ہے کہ نکلتی آرہی ہے، دونوں رخساروں پر یہ گہرے گول گول گڑھے مچل اُٹھتے، اور جب تک بھابی جھپاک سے پنکھے کی ڈنڈی اس کے حلق تک نہ لے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جمیلہ پر تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گدگدانے لگتا، اور وہ زور زور سے چلّاتا۔ "بھابی، بھابی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔"

نہ جانے کیوں، بھابی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سنتے ہی بلبلا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُٹھتی ''اللہ نہ کرے کسی کو دورہ پڑے۔ میری توبہ، نسیم تیرے مُنہ میں لگام بھی تو نہیں۔'' نسیم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جمیلہ بیٹھے بیٹھے سکڑتی سی جاتی اس کا رنگ خواہ مخواہ قرمزی سا ہونے لگتا، اور نسیم کا جی تلملاتا کہ وہ اس گدری سی گٹھڑی کو ربڑ کی گیند کی طرح دبا کر پچکا دے! گیند؟ ارے معاذاللہ---جمیلہ کا چھریرا بدن شہتوت کی ٹہنیوں کی طرح جھومتی ہوئی نازک بانہیں، لمبی لمبی ناچتی ہوئی سی ٹانگیں، چھم چھم تھرکنے والے سڈول پاؤں---جس دن وہ چوڑے چوڑے پانچوں والی کاسنی شلوار، نیلے مورا کین کا پھولدار پھنسا پھنسا کرتہ، اور گلابی ریشم کا سرسراتا ہوا دوپٹہ پہن کے آتی، تو نسیم کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور وہ جھپ جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پردوں کے پیچھے کھسکتا جاتا---''آؤ میری پھلجھڑی!'' بھابی ہنس کر کہا کرتی---''اونہوں۔'' جمیلہ گلابی ہونٹ بسورتی۔ ''پہلے شبرات تو آنے دو، بھابی!'' نسیم پردوں کو بانسوں پر لپیٹ کر گھومتا، اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا---''شبرات آگئی، بھابی؟ اور حلوا؟''

''شبرات بھی آئے گی، بھیا۔ ابھی تو پھلجھڑی آئی ہے!'' بھابی شرارت سے کہتی۔ جمیلہ شرما کر اپنا سر بھابی کی گود میں چھپا دیتی۔

نسیم خواہ مخواہ انجان بنتا۔ ''آہا بھابی۔ پھلجھڑی کیا، ہم تو انار لیں گے، انار----چم چم کرتے ہوئے انگارہ سے انار! پٹاخے---گلابی گلابی، کاسنی کاسنی، نیلے نیلے کاغذوں میں لپٹے ہوئے پٹاخے---جو دل کی دنیا ہلا کر رکھ دیں------ اور پھر بھابی کی ناک کی طرح تیز تیز نکیلی چھچھوندریں------''

بھابی زور زور سے ہنستی اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا پنکھے کی ڈنڈی پر جا پڑتا! جمیلہ سکڑتی سکڑتی بھابی کی گود میں دھنستی جاتی، دھنستی جاتی، اور پھر بھابی اس قوسِ قزح کے ٹکڑے کو دھکیل کر پیڑھی پر بٹھا دیتی۔ ''اب ہٹ بھی جمیلہ پاگل کہیں کی!''

نسیم جھک کر بھابی کے سامنے رکھی ہوئی ٹوکری میں سے مٹروں کی

پھلیاں اٹھاتے ہوئے چوری چوری جمیلہ کی طرف دیکھتا---دیکھا بھابی میں نہ کہتا تھا، وہ گلابی جارجٹ نہ لو----رنگ کچا ہے!''

''اے ہے، کچا نہ کچا۔'' بھابی اپنے گلابی جارجٹ کی قمیض پر دونوں ہاتھ پھیرتی ''چار دھو دھل چکی ہے، لیکن ویسی کی ویسی تو پڑی ہے------''

''ہاں ہاں، جی دیکھ لو، کچا ہے، جمیلہ کے مُنہ پر کتنا لگ گیا ہے------ ہی ہی ہی------ ہی ہی ہی------'' وہ پھول سے دانت کھلتے، قہقہوں کی آندھی سے چلتی، بھابی کے پنکھے کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی---اور جمیلہ اپنے تمتماتے ہوئے بھبھوکا سے گالوں کو کہنیوں میں چھپائے بھاگتی جاتی، پھر رکتی، جھجکتی، لوٹتی، گھومتی-----اور اس کو بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آ جاتیں، اپنی اُون، بھابی کی چوڑیاں------ اور پھر وہ ڈیوڑھی پر لگی ہوئی موٹی سی چق اُٹھا کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی رنگیلی پتنگیں شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو جائیں!

نسیم کے دل میں طرح طرح کے ہوائی قلعے بنا کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا، کہ جمیلہ ریشم کے پتلے پتلے دھاگوں میں بندھی ہوئی پتنگ کی طرح آسمانوں میں اُڑتی جا رہی ہے---- اُونچی اُونچی، ستاروں کے جھرمٹ پھاندتی ہوئی---اور پھر وہ چاند کی پیشانی پر ایک سترنگے قشقے کی طرح جا بیٹھی----!! یا، جب وہ کہکشاں کی دودھیلی کیاریوں کو دیکھتا، تو اس کے دل میں بے باک سی، باغیانہ سی جھلکیاں آنے لگتیں----جیسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلی قمیض نے کہکشاں کے ایک بکھرے ہوئے آوارہ سے ٹکڑے کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات اُسے ایک بھیانک اور منحوس سا خواب نظر آتی---وہ جھنجلا کر اپنے انگلیاں چبانے لگتا، کہ اس کا بس چلے تو وہ بادلوں کی چادر کو نوچ کر تار تار کر ڈالے جس نے کہکشاں کی لطیف سلوٹوں پر گھنے گھنے سائے ڈال رکھے ہیں----اور نہ جانے کیوں اُسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلے مورا کین کی قمیص پر غصہ آنے لگتا-----اور وہ دالان میں کھڑا ہو کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہتا کہ بھابی پنکھے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں مار دے----

ایک روز وہ مچھلی کے شکار کو گیا- ندی کا نیلگوں پانی ہلکی ہلکی لہروں میں چھلک رہا تھا---چھوٹی چھوٹی، اُلجھی ہوئی سی لہریں---سفید گلاب کا ایک بڑا سا پھول ان کے بہاؤ میں تیز تیز جا رہا تھا---ڈگمگاتا ہوا، تھرکتا ہوا، کبھی وہ مچلتی ہوئی لہروں کے زیر و بم میں ڈوبتا، کبھی اچھلتا، پھر ڈوبتا، پھر اچھلتا----اور نسیم کا جی بے اختیار اُکسا کہ وہ دھم سے پانی میں کود پڑے، اور اس تیز رفتار پھول کو جھپٹ کر روک لے----جو جمیلہ کی گول گول، سفید ایڑی کی طرح بھاگتا ہوا، جا رہا تھا---ہائے جمیلہ کی ایڑیاں! جب وہ اپنا تمتمایا ہوا چہرہ کہنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی چق کی طرف بھاگا کرتی تو نسیم چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی گول گول سڈول ایڑیوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاسنی شلوار کے آبشاری پائنچے اور گردابی بل کبھی گرتے کبھی اٹھتے کبھی اُٹھتے، کبھی گرتے------

اور پھر آخر شبرات آئی! بھابی عورتوں کی مجلس میں گئی ہوئی تھی- نسیم کمرے میں بیٹھا پٹاخے گن رہا تھا- اتنے میں پھلجھڑی آ گئی! رنگین شراروں کی طرح چھم چھم کرتی اور دالان میں کھڑی ہو گئی-

"بھابی، یہ لو چھچھوندریں!" اس نے ہلکی سی ہنسی دبا کر کہا-

نسیم چونکا- "اوہو، پھل جھڑی ہے؟ ذرا پٹاخوں سے بچ کے رہنا!"

"میں تو بھابی کو پوچھتی ہوں-" جمیلہ نے ایک ادا کے ساتھ کہا-

"بھابی نہیں ہے-" نسیم خرگوش کی طرح بھاگتا ہوا آیا، اور مٹھی بھر پٹاخے زمین پر مار کے بولا---"یہ گئے پٹاخے! اب باری ہے پھلجھڑی کی!"

جمیلہ شرما کر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی---نسیم بھاگا- ٹھس، ٹھس ٹھس------ پٹاخے چھوٹ رہے تھے- جھررررر---جمیلہ کا پاؤں شلوار کے پائنچے میں اُلجھا اور وہ دھڑام سے گری---نسیم نے لپک کر سنبھالا، اور بانسوں پر اُٹھا لیا---انار، شرارے!! آگ!!! دونوں کھو سے گئے، جس

طرح آتشبازی کے شعلوں میں دھوآں کھو جائے------ اور ایک دودھیا سی بے باک ٹانگ ہوا میں ناچنے لگی، جیسے قوسِ قزح کی لڑیوں سے کہکشاں کا دھارا پھوٹ نکلے! اور پھر وہ جاگی، جھجکی، گھبرائی----اور بے اختیار بھاگی- اس کا پھٹا ہوا پائنچہ پیچھے پیچھے گھسٹنے لگا---جس طرح پھلجھڑی کے ساتھ ساتھ چھچھوندر بھاگ رہی ہو!

دوسرے روز وہ آئی، تو سفید بوسکی کا سیدھا پاجامہ پہنے ہوئے تھی- بھابی دیکھتے ہی چلائی---- "اے ہے---- جمی، یہ کیا لڑکا سی بن گئی ہو؟ شلوار کیا ہوئی؟"

جمیلہ کا مُنہ گرما گیا- "کل پاؤں اُلجھا، تو پھٹ گئی- میں بھی تو دھڑام سے گری بھابی---اب سب کے نگوڑے پائنچے چھوٹے کروانے دے دیئے ہیں-"

"توبہ، چوٹ تو نہیں آئی؟" بھابی نے پوچھا-

"بہت ہلکی سی!" جمیلہ نے ایک چھپے ہوئے سرور کی جھرجھری لے کر کہا- اور پھر وہ یکایک جھینپی- اور بات ٹالنے کے لئے بولی- "کل کا جلسہ کیسا رہا، بھابی؟"

"بڑے مزے کا- بیگم غیاث نے اچھا خطبہ دیا- تم کیوں نہ آئیں؟"

"یونہی رہ گئی---خطبے میں کیا کہا؟"

"بہت سی باتیں- شبرات کی فضیلت اور جانے کیا کیا؟ توبہ، سب کچھ یاد بھی تو نہیں رہتا---"

"بھابی، شب برأت میں فرشتے اُترتے ہیں؟" نسیم نے پردے کے پیچھے سے مُنہ نکال کر پوچھا-

"اللہ میاں کی رحمت ہے بھیّا- فرشتے تو آتے ہی ہیں-" بھابی نے ایک قسم کی روحانی سنجیدگی سے کہا-

"اور حوریں، بھابی؟" جمیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارتاً پوچھا-

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں ہاں، ضرور!" نسیم چلّایا۔ "لیکن پھٹی ہوئی شلواروں والی-----"

جمیلہ کے گالوں پر گلابی ڈورے آئے، اور وہ پانی کے ریلے کی طرح مچل کر بھاگ گئی۔

"توبہ، ایسی بات بھی کوئی کہتا ہے بھلا؟" بھابی نے چائے کی پیالی کھٹ سے پرچ میں رکھ کر کہا۔

"میں نے کوئی اُسے کہا تھا کچھ؟ شلوار کی بات تھی!"

"چل چپ رہ۔ بڈھا ہو گیا ہے، اور بات کی تمیز نہیں----"

"تو میں کیا کروں بھابھی؟ یہ لباس ہی بدتمیز ہے!" نسیم نے بات ٹالی۔ بھابی کو بھی غصہ آ گیا۔

"شلوار؟" اس نے میز پر مکّا مار کے کہا۔ "کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے-----"

جِگ جِگ

"جِگ جِگ، حضور؟" سفید داڑھی والے بیرے نے کافی کی پیالی میز سے اٹھا کر پوچھا۔

افضل نے کہا۔ "لے آؤ۔" کلکتہ میں آتے ہی ٹرام میں اس نے کسی کو پہلی بار جِگ جِگ کہتے سنا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ ڈم ڈم یا بج بج کی طرح کسی جگہ کا نام ہوگا اب رات کے کھانے پر جب ہوٹل کے بیرے نے پوچھا "سُوپ، حضور؟" تو افضل نے کہا، لے آؤ۔" کٹلس حضور؟----لے آؤ! سلطانہ پڈنگ، حضور؟۔ لے آؤ!----- جِگ جِگ حضور؟----لے آؤ! افضل نے سوچا کوئی چینی مٹھائی ہوگی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے رونگٹوں میں کپکپی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ ابھی شراب کو مُنہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لئے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً سگرٹ----کالج میں وہ کئی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کو اس نے ایم۔ اے پاس کرنے تک اُٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اب وہ چار مہینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جی بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدسیہ تھی۔ قدسیہ کا بام یہی کوئی دو چار ہاتھ دور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی منگیتر تھی۔ اور اگلے مہینے کی دس تاریخ کو رواجاً اس کی ملکیت میں آنے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رگیں ایسی بھی ہیں، جو آرزوئے ملکیت پر بے اختیار پھڑک اُٹھتی ہیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا، اور جب بنک کی پاس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بک پکار کر کہتی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا---تو اسے ایک خفیہ تسکین ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لئے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا! لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوشنما کوٹھی بنوائی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے حرفوں میں "افضل کدہ" لکھوایا گیا۔ اُوپر انگریزی میں، نیچے اردو میں۔ جب کوئی راہگیر اچانک اس نام کو پڑھ کر گزر جاتا تھا، تو شاید افضل کی کوئی خاموش رگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوبصورت مکان کریم بخش کا ہو۔ یا طوطا رام کا------

اب اگلے مہینے اس کی ملکیتی جائداد میں قدسیہ کا لچکتا ہوا چھریرا جسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدسیہ کو پالینے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھندلی سی افقی لکیر میں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تخیل قدسیہ کو لیکر تاج محل اور اجنتا آرٹ کی سیاحت کے لئے چل نکلتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصوّر میں ارغوانی لہروں والے چمچماتے ہوئے پیگ گھوم جاتے تھے------ اصل میں قدسیہ کے بعد افضل کی تمناؤں پر زنگ سالگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس گرم گرم دہکتے دہکتے ہوئے کوئلے کی طرح رہ جائے گی۔ جسے پانی میں ڈال کر چھن سے بجھا دیا ہو----افضل آوارہ مزاج نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزاج تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہریں گنتی ہے۔ آوارگی ان لہروں کی آغوش میں کود جاتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معاً یہ خیال آیا کہ شاید جگ جگ کسی شراب کا نام ہو، تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لائحہ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجود قدسیہ کا وجود تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا تو ماں کا روپ ہوتا ہے، یا بہن کا یا بیوی کا---وہ عورت کو ایک سترنگی پینگ نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر قوسِ قزح کی طرح تنی

ہوئی ہے جب وہ قدسیہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باق ہوگیا ہے۔ یعنی سارے جہان کی عورتوں میں اُس کے حصّے کا جو ٹکڑا تھا، وہ اسے مل گیا۔ افضل نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اسے حق ہوگیا تھا، کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کے وہ دنیا سے اپنے حصّے کی عورت مانگ لے۔ چونکہ وہ اتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا، اس لئے دو چار عورتیں بھی مانگ سکتا تھا------

ہوٹل کا ڈائیننگ روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تیز تیز برقی قمقمے جگمگ جگمگ جل رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہوئے آئس کریم کھا رہے تھے۔ ایک بیرا بہانے بہانے جھک کر میز کے نیچے نظر دوڑاتا تھا۔ ادھیڑ عمر والے آدمی کے گھٹنے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر ناچ رہے تھے---بائیں طرف ایک بھڑکیلی سی لڑکی بناؤ سنگار کئے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میلے کپڑوں والا لڑکا تھا۔ ان کے سامنے چائے کی پیالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چائے پیتے تھے۔ نہ آپس میں بولتے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھیں۔ یکایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی طرح جگمگا اُٹھی۔ وہ دیر تک کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر وہ میلے کپڑوں والا لڑکا کسی بہانے اُٹھ کر چلا گیا۔ لڑکی نے گول گول آنکھیں گھما کر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو چمچے سے مدھم مدھم سُر میں بجانا شروع کیا۔ اس جلترنگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی اکیلی لڑکی کو کھلے طور پر گھورا نہیں تھا۔ اب اس بھرے ہوئے ہال میں وہ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا؟ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا، جس میں غصہ تھا، مایوسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی، عزم تھا شرم تھی---- لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وقت کا پنچھی اور دریا کی لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ یہی اصول عورت کا ہے۔ افضل اپنے عجیب سے اضطراب میں اُلجھا رہا۔ اتنے میں ہال کے دوسرے کونے سے ایک لڑکھڑاتا ہوا آدمی آیا۔ اور دھم سے لڑکی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے جلدی سے آکر کھانے کا آرڈر لیا۔ ان دونوں کے گھٹنے میز کے نیچے مل گئے۔ ان کے پاؤں کسی خاموش تال پر ناچنے لگے۔ اور افضل کو بیٹھے بٹھائے یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکھڑاتے ہوئے شرابی نے چانٹا مار کر اس کے مُنہ کا سگرٹ چھین لیا ہے!

اتنے میں سفید داڑھی والا بیرا دروازے میں نمودار ہوا۔ افضل کو احساسِ شکست نے اداس کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی کم ہمتی پر شرمندہ ہو رہا تھا اگر جِگ جِگ کوئی تیز اور تند شراب بھی ہوتی، تو اس وقت افضل ضرور دو گھونٹ پی لیتا۔ لیکن جب اچانک سفید داڑھی والے بیرے نے اس کے سامنے شراب کی جگہ ایک چھلکتی ہوئی عورت کو لا بٹھایا، تو اس کے قدم لڑکھڑائے، جیسے چاند کے لئے ضد کرنے والے بچّے کے ہاتھ میں سورج کا دہکتا ہوا الاؤ رکھ دیا جائے! اُس نے بیٹھتے ہی میز کے نیچے اپنے گھٹنے افضل کے گھٹنوں سے ملا دیئے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ عورت مسکرانے لگی، جیسے کہہ رہی ہو---"میں تمہاری ماں نہیں ہوں، بہن نہیں ہوں، مجھ سے ڈرتے کیوں ہو؟-----"

"بوائے، میرا بل لاؤ۔" افضل نے زور سے چیخ کر کہا۔

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس بدتمیزی پر ناک چڑھائے۔ وہ عورت غصّے سے کانپ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے موٹے موٹے نتھنے پھول گئے۔ اور اس نے سفید داڑھی والے بیرے کو قہر آلود نظر سے دیکھ کر کہا۔ "تھو، غفور چاچا۔ سفید بال ہوگئے تیرے۔ پر آدمی کی پرکھ نہ آئی اب تک!" اور پھر وہ تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح میزوں کے گرد منڈلانے لگی۔ ایک موٹا سا آدمی

وسکی کا گلاس سامنے رکھے اونگھ رہا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا، اور زیرِ لب بڑبڑایا۔

"جِگ جِگ؟"

"جِگ جِگ!" عورت نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر وہ دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو دس برس کا گول مول سا چھوکرا اس کی طرف لپکا۔ "گوری بی بی، جناب؟" چھوکرے نے افضل کی انگلی پکڑ کر پوچھا۔

افضل نے اُسے جھڑک دیا۔

"کالی بی بی جناب؟" چھوکرے نے دوسری پیشکش کی۔

افضل نے پھر اُسے ڈانٹ دیا۔

"جِگ جِگ جناب؟" چھوکرے نے اصراراً کہا۔

افضل نے اسے دھکّا دے کر پرے پھینک دیا۔

افضل میں اخلاقی جرأت کے ساتھ ساتھ ظرافت کا مادہ بھی عنقا تھا۔ ورنہ وہ اس گول مول چھوکرے کو دھکیل کر پرے نہ ہٹاتا۔ وہ ننھا سا لڑکا راہگیروں پر لپک لپک کے ان کے معیار کا سودا کیا کرتا تھا۔ اس کے بیوپار میں کئی قسم کی جنس تھی۔ کالی بی بی اور گوری بی بی رنگت میں امتیاز تھا۔ نسل میں فرق تھا۔ بازار الگ الگ تھے، قیمت جدا جدا تھی---- لیکن جِگ جِگ ایک بین الاقوامی چیز تھی۔ وہ بنی نوع انسان کی مشترکہ جائداد ہے۔ اس میں کالے گورے پیلے بھورے کی تمیز نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے، اور ہر کسی کے لئے ہے۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح جس کی ایک پھانک کاٹ کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہو!

افضل جس طرف جاتا تھا، اس کے سامنے جِگ جِگ آ جاتی تھی کلکتے کی ساری شاہراہیں ایک ہی منزل پر مل رہی تھیں ٹیکسیوں میں جِگ جِگ تھی،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رِکشاؤں میں چِک چِک تھی، گھوڑا گاڑیوں میں چِک چِک تھی---وہ سرسراتی ہوئی خوبصورت ساریوں میں تھی- اس نے رنگ برنگ فراق پہنے ہوئے تھے وہ عظیم الشان کمروں میں تھی- وہ خوشنما پردوں کے پیچھے تھی- وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی---ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی- جس کی ایک پھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہو!

وہ ایک لدی ہوئی ٹرام میں پھنس کر کھڑا تھا- اس کے پہلو میں ایک نازک سی لڑکی تھی، جس کے تراشے ہوئے بال پھولوں کی طرح مہک رہے تھے- جب ٹرام رکتی تھی، تو ہر ہچکولے کے ساتھ اس لڑکی کا سارا بوجھ افضل کے کندھوں پر آ گرتا تھا- اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں بسا ہوا ریشم کا تھان اس پر ڈال دیا ہو---وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا، کہ ٹرام قدم قدم پر رکے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں، اور پھر وہ کسی دوسری ٹرام سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے----- جیسے تارے ٹوٹتے ہیں! لیکن دعا منوانے کے لئے بھی ہمت درکار ہے- ٹرام گڑگڑاتی بھاگی جا رہی تھی- ایک تند خُو نوجوان کھسکتا ہوا آگے بڑھا، اور ان دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا- اب افضل کو شاید پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہچکولے لگنے کے لئے ضروری نہیں کہ ٹرام کو جگہ جگہ رُکنا پڑے!

"نان سنس" اس لڑکی نے غصّے سے نوجوان کو ڈانٹا-

"چِک چِک!" نوجوان نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کے کہا-

"چِک چِک!" وہ مسکرا پڑی------

عین اس وقت افضل کو سفید داڑھی والا بیرا یاد آ گیا- اور پھر وہ بھڑکیلی لڑکی جو چائے کی پیالی پر چمچہ مار کر جلترنگ بجا رہی تھی------ لیکن پھر اچانک اسے قدسیہ یاد آ گئی- اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی- وہ کلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا- اس کا یہ مطلب تو نہ تھا، کہ وہ ہر راہ چلتی عورت کے قدموں میں پامال ہو جائے- اس نے جیب سے چیزوں کی

فہرست نکالی، اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا-

یہ دکان کلکتہ کی بڑی دکانوں میں سے تھی- اس میں مختلف چیزوں کے لئے الگ الگ سکشن تھے- ہر سکشن میں گاہکوں کی مدد کے لئے آدمی یا عورتیں مامور تھیں- سٹیشنری والے حصّے میں ایک خریدار کاؤنٹر پر جھکا ہوا کھڑا تھا- ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھریوں کی پہلی لہر اُٹھنے والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لا رہی تھی- رائٹنگ پیڈ، لفافے، سیاہی----- اور پھر خریدار نے اِدھر اُدھر دیکھ کر زیر لب کہا- "چِک چِک!" عورت کے سنجیدہ چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی- اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا- اور پھر مسکرا پڑی-

ایک خوبصورت اور جوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو رہی تھیں- تین بے باک چھوکرے سگرٹ پیتے ان کے پاس سے گذرے- انہوں نے بنی ٹھنی ہوئی دلہن کو گھور کر دیکھا- پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور سگرٹ کا دھواں زور زور سے موم کے ان رنگین مجسّموں پر چھوڑنے لگے- جو نمائشی ساڑھیاں، گاؤن اور فراک پہنے کھڑے تھے-

ان مجسّموں کے اعضاء، اقلیدس کی شکلوں کی طرح متناسب تھے- ان کے انداز میں دنیا بھر کی رعنائیوں کو منجمد کر دیا گیا تھا- اگر کوئی آرٹسٹ ان کے بدن میں تھوڑا سا لوچ، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً گاؤنوں اور فراکوں اور ساڑھیوں کے ساتھ وہ بھی مہنگے داموں بِک جاتے! افضل ایک مجسّمے کے سامنے کھڑا ہو گیا، جس نے سلمے ستارے والی آسمانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی- وہ اس کے رنگین رخساروں کو دیکھتا رہا اور پھر ساڑھی دیکھنے کے بہانے اس نے مجسّمے کی ٹھوس کمر کو زور سے دبا دیا اس کے دل میں ایک زبردست خواہش اُبھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے لپٹ جائے اور اس کے کانوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں چیخ چیخ کر کہے۔ "جِک جِک، جِک جِک، جِک جِک------"

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟" عقب سے ایک جوان چھوکری نے پوچھا۔ افضل اچک کر ایک طرف ہوگیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی فراک والے مجسّمے میں یکایک جان پڑ گئی ہے۔

"جی ہاں، مجھے کچھ ساڑھیاں چاہئیں، کچھ فراک------" اس نے جلدی جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں وہ اور کوئی بات نہ بتا سکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تکونے کمرے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر قسم قسم کی ساڑھیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ وہ ساڑھیوں کی جگہ فراک والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت سے مُنہ پھلا لیا۔ اور پھر ایک ملائم سی ریشمی ساڑھی کے نیچے ان کی انگلیاں اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار لحہ بھر کے لئے تھم گئی۔ افضل کے دل کی گہرائیوں سے جِک جِک کا لفظ ایک مستانہ ترنم کے ساتھ ابھرا، لیکن گلے تک آ کے اٹک گیا جیسے ناچتی ہوئی رقاصہ کا پاؤں دھم سے اگالدان میں پھنس جائے------ اس نے جلدی جلدی ساڑھیوں کا پلندا سنبھالا اور باہر نکل آیا۔ سڑک کے کنارے ایک خالی رِکشا والا پہیے سے لگا اونگھ رہا تھا۔ افضل اچک کر اس میں سوار ہوگیا رِکشا والا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، اور نیم خوابی کی حالت میں بولا۔ "کہاں چلیں گے حضور؟ دھرم تلے؟"

"حرامزادہ۔" افضل کڑک کر بولا۔ "دھرم تلے میں تیری ماں ہے سالے؟" رِکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح رِکشا میں جُت گیا۔ اب اس کی نیند بھی دور ہوگئی تھی۔

"جِک جِک، حضور؟" اس نے رِکشا کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں سالے ہاں۔" افضل دوبارہ کڑکا۔ جِک جِک ماں نہیں ہے، جِک جِک بہن نہیں ہے، جِک جِک بیوی نہیں ہے---تو کیا جِک جِک سانپ ہے؟ وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لڑتا جا رہا تھا!

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کٹی ہے رات تو------

"اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف------" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ اور پھر کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر کے یک لخت چپ ہوگئی۔

"جی نہیں۔ لیکن------ شاید آپ کو تکلیف------ خیر------" میں نے ناول بند کر دیا۔ اور برتھ سے اُٹھ کر ہکلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ہکلانا میری عادت نہیں۔ لیکن جب یکایک کوئی خوبصورت عورت میرے سامنے یوں آ جائے جیسے آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا گر پڑا ہو، تو مجھے دہشت سی ہونے لگتی ہے۔ وحشت نہیں، ایک گوناگوں کیفیت کہئے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اے شعلۂ جوّالہ! ذرا سنبھل کے۔ تیرے سامنے پروانہ بھی ہے، جو جل جائیگا------

شعلۂ جوّالہ! ہائے، یہ لفظ یاد آتے ہی میرے دائیں گال پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگتا۔ کل جب ہم سب لوگ ہمایوں کے مقبرے کی طرف پِک نِک پر گئے، تو پرانے قلعے کی ایک ٹوٹی ہوئی خندق سے اُچھل کر حمیدہ زور سے ہوا میں اچھلی۔ اور اگر میں نے اُسے بڑھ کر سنبھال نہ لیا ہوتا، تو غالباً وہ مُنہ کے بل گرتی۔ اور اس کی تیکھی ناک کے ساتھ جو ایک مصوّرانہ تخیل وابستہ ہے، ضرور چِپٹا جاتا۔

"اوئی اللہ! مجھے چھوڑیئے۔" اس نے میری گرفت سے نکلنے کی ایک تکلفانہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کے گال دیکھ کر جل سا گیا، جو لال لال انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "اے شعلۂ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوالا!" اور حمیدہ نے سب کی آنکھ بچا کر میرے مُنہ پر ناز سے ہلکا سا طمانچہ مارا۔

وہ حمیدہ کی بات تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ناز اٹھانے کی مشق تھی۔ لیکن اس وقت جو خوبصورت خاتون یک بیک میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اس کے تجاہلِ عارفانہ اور ایک نمایاں سے عالمِ استغراق نے مجھے ہکلانے پر مجبور کر دیا۔

ہمارے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں صرف دو نشستیں تھیں۔ اُوپر والی سیٹ پر ایک امریکی کرنل لیٹے ہوئے تھے۔ نچلے برتھ پر میرا بستر تھا۔ دہلی سے چل کر کچھ دیر تو ہم دونوں مدبرانہ سی بحثوں میں اُلجھے رہے، جن کے دوران میں بہت سی حکومتوں کے بخیے ادھیڑے۔ بہت سی قوموں کے چاکِ گریبان سِی دیئے گئے---اور کوئی رات کے دس بجے کے قریب جب ہم غالباً ساری دنیا کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا چکے، تو کرنل صاحب اچک کر اپنے برتھ پر چڑھ گئے اور اپنی نیند کے چمن میں اُونچے اُونچے خراٹوں کا ارغنوں بجانے لگے۔ کچھ ایسی بات ہے، کہ چلتی گاڑی میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ شاید بچپن میں مجھے پنگوڑوں کے جھولے نصیب نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے وقت کٹی کا سامان کیا، اور ڈی۔ ایچ لارنس کی ایک ترقی یافتہ کتاب نکال کے رکھ لی!

طوفان ایکسپریس رات کے سناٹے میں فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ امریکی کرنل کسی بھیانک خواب سے متاثر ہو کر خراٹوں میں شدید قسم کی گولہ باری کر رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی لیڈی چیڑلے جوانی کے سمن زاروں میں------ خیر۔ جب ٹرین علی گڑھ کے سٹیشن پر جا کے رکی، تو یکایک ایک رنگین رخساروں والی بھڑکیلی عورت بجلی کی طرح کوند کر ہمارے ڈبے میں داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں۔ مُنہ کھل سا گیا۔ اور ماننا پڑے گا کہ میں کچھ بوکھلا کر اٹھا بیٹھا۔

"اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف-----" وہ میری طرف دیکھ کر

بولی۔ اور پھر دروازے کی چٹخنی اندر سے بند کر کے یک لخت چپ ہو گئی۔

اعتراض؟ ارے، معاذاللہ کون کافر اس گناہِ بے لذت کا بار اٹھاتا۔ میں نے سوچا، چلو گھڑی دو گھڑی کے لئے رنگینیٔ محفل کا سامان ہوا۔ کہاں روز روز ایسے رومان ہاتھ آتے ہیں۔ کہ رات کا سناٹا ہو۔ ریل کی ٹھٹ ٹھٹ گزر کر عمرِ رواں کی طرح لمبی لمبی مسافتوں کو دامن میں لپیٹتی ہوئی بھاگی جا رہی ہو۔ ڈبے میں امریکی کرنل بے ہوش سویا ہوا ہو---- عین اس وقت جوان رعنائیوں سے چھلکتی ہوئی ایک حسین عورت یوں آ جائے، جیسے راہ چلتے مسافر کی جھولی میں پکے ہوئے انگوروں کا خوشہ ٹپک پڑا ہو----- اور پھر ڈبے میں کوئی خالی برتھ بھی نہ ہو!

وہ اپنا اُونی اوور کوٹ اُتار رہی تھی۔ میں نے کوٹ تھام کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ "شکریہ"۔ اس نے بھیگی بھیگی سی مترنم آواز میں کہا۔ آسمانی ریشم کی لہراتی ہوئی ساڑھی میں وہ ایک مرمریں مجسمے کی طرح لپٹی ہوئی تھی---یا یوں کہئے، کہ چودھویں کے چاند کا عکس کسی گرتی ہوئی آبشار کی نیلاہٹوں میں ہولے ہولے رقص کر رہا تھا۔

"ہوا کتنی سرد ہے۔" میں نے کھڑکیوں کی جھلملیاں بند کرتے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ اور کوئی سامان نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔" وہ اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ گود میں ڈال کر میرے بڑے ٹرنک پر بیٹھ گئی۔ "زندگی کا بوجھ خود کیا کم ہے؟" اس نے آہستہ سے زیرِ لب کہا۔ "یہ گرانبار زندگی!" اس نے ایک آہ سی بھری۔

"اوہو، آپ ٹرنک پر کیوں بیٹھی ہیں؟" میں نے کہا۔ "یہ برتھ جو خالی ہے"

"جی نہیں شکریہ۔ میں آپ کو تکلیف نہ دوں گی۔"

"اخاہ تکلیف کیسی؟ برتھ آپ کا ہے۔ شوق سے استعمال کیجئے۔"

"آپ اصرار نہ کریں۔ میں بہت آرام سے ہوں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ذرا دیکھئے تو" میں نے التجا کی۔ "آپ ساری رات کیسے گزاریں گی؟" "گزر ہی جائیگی۔" اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ "یہ تو ایک رات ہے۔ سہارا تنکے کا بھی ہو، تو زندگی بیت جاتی ہے۔"

"آپ تو مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا، اور برتھ پر بٹھا دیا۔

اس نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور پھر آنکھیں جھکالیں میرے ہاتھوں میں ابھی تک بجلی کی لہری تڑپ رہی تھی۔ لیکن اس کی سہمی ہوئی نگاہیں دیکھ کر مجھے پشیمانی کا احساس ہونے لگا۔

"معاف کیجئے گا" میں نے معذرت کی۔ "آپ کو بُرا تو نہیں لگا؟"

"جی نہیں۔" اس نے اپنی نازک ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کے کہا۔ "دنیا میں کمزور ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

میں شرمندہ ہوگیا، اور ٹرنک پر بیٹھ کے سگرٹ سلگانے لگا۔ وہ چھت پر جگمگاتے ہوئے قمقمے سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی سرمگیں آنکھوں کے دامن میں پُراسرار چشمے سے ابل رہے تھے۔ برتھ پر بیٹھی ہوئی وہ کسی مصور کا رنگین شاہکار نظر آتی تھی۔ جو قوسِ قزح کی لڑیوں کو ملا کے بنایا گیا ہو---یا شاید وہ کہکشاں کا ایک آوارہ ٹکڑا تھی----- میرا تخیل چوری چوری شاعری کر رہا تھا!

"آپ کہاں تک جائیں گی؟" میں نے وہ سکوت توڑنا چاہا جو میری خجالت نے کمپارٹمنٹ پر طاری کر دیا تھا۔

"جی؟" وہ جیسے کسی گہرے خواب سے چونک اُٹھی۔ "کیا فرمایا آپ نے؟"

"معاف کیجئے گا۔ میں یونہی آپ کے استغراق میں مخل ہوا۔"

"جی نہیں۔ آپ شوق سے فرمایئے۔ میں تو یونہی بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہوں۔"

"آپ کو کچھ پریشانی ہے؟"

"پریشانی؟---جی! یہ تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے ذرا شوخی سے کہا۔ "اگر آپ مصور نہیں تو شاعر ضرور ہیں!"

وہ مسکرائی۔ "جی شاید۔ اپنا اپنا خیال ہے----خیر-----"

"آپ بہت افسردہ ہیں۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "اگر آپ کا سفر لمبا ہو، تو آرام سے سو جایئے۔"

"سفر تو بے شک لمبا ہے۔ بہت طویل۔ لیکن منزل کا نشان کسے ملتا ہے۔ اگر ملے بھی تو بھی سراب ہے۔" اس نے اپنی بے چین نگاہوں کو ڈبے کی محدود چاردیواری میں گھمایا اور پھر کہنے لگی۔ "ابھی آپ کہتے تھے کہ میں مصور ہوں یا شاعر۔ کاش میں کچھ تو ہوتی۔ میری تو آرزو ہے کہ زندگی کا ایک مکمل شاہکار بناؤں-----جس کی لکیریں ٹوٹی ہوئی قسمت کی طرح ٹیڑھی ہوں، جس کی سانس میں کائنات کی ازلی ہچکیاں تڑپ رہی ہوں------ اے کاش!" اس نے ایک دلدوز آہ بھری۔ وہ درد کی کسی بے چین کسک سے جھرجھریاں لے رہی تھی۔ نہ جانے اس کے ہانپتے ہوئے سینے میں کن کن المناک جذبوں کا جوار بھاٹا اُمڈ رہا تھا۔

وہ کبھی ایک تھکے ہوئے خوابیدہ انداز سے بولتی تھی۔ کبھی اس کے عنابی ہونٹوں پر خاموشی کا غبار سا چھا جاتا تھا۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔ وہ ایک سیشن جج کی بیوی تھی۔ اسے دنیا کی ساری نعمتیں میسر تھیں۔ وہ اُونچے گھر پیدا ہوئی۔ کشمیر کے شاداب خیابانوں میں پلی۔ ہریالی چٹانوں اور گانے والے جھرنوں کے ساتھ کھیل کر جوان ہوئی۔ وہ جہاں کہیں بھی۔ کلب کی محفلیں اس کے دم سے آباد ہو جاتی تھیں۔ رقص گاہوں کی فضا اس کے وجود سے مہک اٹھتی تھی---"لیکن معاف کیجئے۔" وہ یکایک جھجک گئی "میں یونہی آپ کی سمع خراشی کر رہی ہوں۔ معاف-----"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جی نہیں۔" میں نے اشتیاق سے التجا کی۔ "یہ آپ کیا فرماتی ہیں؟ آپ کی زندگی میں ضرور کوئی خلش ہے۔ آخر انسانی ہمدردی بھی کچھ چیز ہے۔ زندگی کا دکھ بٹتا تو نہیں، لیکن سنانے سے ہلکا تو ہو جاتا ہے۔"

وہ ایک تھکی ہوئی انگڑائی لے کر برتھ پر نیم دراز ہوگئی۔۔۔۔"شکریہ"۔ اس نے ایک ایسی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر دنیا میں انسانی ہمدردی نہ ہوتی تو یہ زمین آگ کا انگارہ بن جاتی۔ لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہے۔ آپ میری آپ بیتی سننا چاہتے ہیں؟ آپ کی دلچسپی سر آنکھوں پر۔ لیکن سنتے سنتے جب آپ کا شوق مایوسی میں بدل جائے، تو خدارا مجھے بتا دیجئے گا۔ تاکہ میری زندگی میں لمحہ دو لمحہ کے لئے آپ کی ہمدردی کا جو ننھا سا چراغ روشن ہوا ہے، وہ بجھنے نہ پائے۔ میں ڈرتی ہوں کہ شاید صبح کی پو پھٹتے ہی آپ کے دل میں میرے لئے نفرت کا فوارہ پھوٹ بہے گا۔ کون جانتا ہے کہ اپ کو مجھ پر غصہ بھی آئے۔ کیونکہ میں نے آپ کا برتھ ہی نہیں چھینا، بلکہ آپ کے دل سے ہمدردی کے آبگینے بھی چرائے ہیں۔ شاید صبح ہوتے ان آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔۔۔کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟۔۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔۔۔۔۔ اُف میرے خدا۔۔۔۔۔ آپ مجھے ضرور معاف کر دیں۔۔۔۔۔ ضرور معاف۔۔۔۔۔" ۔۔۔۔۔ وہ اپنے تخیل کی رو میں بہتے بہتے خاموش ہوگئی۔ اس کی گھنی پلکیں تھکی ہوئی غنودگی کے ساتھ جھکنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں وہ نیند کی پُرسکون آغوش میں سو گئی میں نے آہستہ سے اپنا سرخ ریشم کا لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

وہ سوئی ہوئی تھی۔ یا شاید وہ نیند کے پردے میں بھی زندگی کے کسی خوفناک تانے بانے میں الجھ رہی تھی، جو مکڑی کے جالے کی طرح اس کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی سانس کے دھیمے دھیمے اُتار چڑھاؤ سے ریشمیں غلاف میں ننھی ننھی پھریریاں اُٹھ رہی تھیں۔ سرخ لحاف کی سلوٹوں میں اس کا چہرا چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔ جو شفق شام کی اوٹ میں چوری

چوری جھانک رہا ہو۔ میں ٹرنک پر بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک گرم گرم، نازک نازک احساس کے ساتھ بے پناہ رحم کا جذبہ سر اٹھانے لگا۔ نہ جانے اس کے سینے کے مدوجزر میں کیا کیا حسرتیں روندی پڑی تھیں۔ شاید وہ اپنے خوابوں کی بستی کو ہمالیہ کے چشموں میں ڈبو بیٹھی تھی۔ شاید اس کی آرزوں کے موتی کسی بھڑکیلی رقص گاہ کے فرش پر بکھر کے پامال ہوگئے تھے۔ شاید وہ اپنے سشن جج خاوند سے محبت نہ کر سکتی تھی۔ شاید وہ سماجی نظام کا ایک اور زخم خوردہ شکار تھی۔ مجھے بے تحاشہ غصہ آنے لگا۔ فطرت کے وسیع مرغزاروں پر تہذیب کے جگمگاتے ہوئے ایوانوں پر، اس کے سشن جج خاوند پر۔ جنہوں نے اس حسین فرشتے کو بے یارومددگار زندگی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ بے سہارا، بے سامان۔ وہ کون ہے؟ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کیا کرے گی؟۔۔۔۔۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کو اپنے بازوں پر اٹھا کر چلتی ہوئی گاڑی سے کود پڑوں۔ اور کائنات کی وسعتوں سے للکار للکار کر کہوں کہ وہ میری حفاظت میں ہے! میں اس کی زندگی کے سامنے ایک مضبوط چٹان کی طرح تن کر کھڑا ہو جاؤں۔ قسمت کے زہریلے تیر اُڑتے ہوئے آئیں اور میرے سینے سے ٹکرا کر چُور چُور ہو جائیں۔۔۔خیالوں کی اس سنہری دنیا میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، کہ میں قرونِ وسطیٰ کا ایک بہادر سپاہی ہوں، جو اپنی محبوبہ کو کندھے پر اٹھا کر ساری دنیا سے مقابلہ کرنے نکلا ہے۔۔۔۔۔ اسی بھول بھلیاں میں بیٹھے بیٹھے شاید ساری رات بیت گئی۔ آسمان پر صبح صادق کی ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی۔ وہ ابھی نیند کی گود میں مدہوش پڑی تھی۔ میں نے ہولے ہولے اپنا صندوق کھول کر ایک عمدہ سا نیلا سوٹ نکالا۔ نئی ٹائی منتخب کی۔ اچھا سا بھینا بھینا عطر چنا۔ اور حجامت کا سامان لیکر غسل خانے میں چلا گیا۔

میں نے خاص اہتمام سے رگڑ رگڑ کے حجامت بنائی۔ اور خوب صابن مل کر رات کے ٹھٹھرے ہوئے پانی سے نہانا شروع کیا۔ تاکہ جب اس کی آنکھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھلے، تو میں زندگی کی ایک نئی صبح کا خوش آئند پیام سنانے کے لئے تیار ہو جاؤں---اتنے میں گاڑی رُکی- غالباً "گیا" کا سٹیشن تھا- کچھ لمحوں کے بعد یکایک ہمارے ڈبے کا دروازہ کھلا- اور ایک پُرشوق آواز پکاری---"ہلو ڈارلنگ تم یہاں ہو؟ میں تو سب ڈبوں میں کھوج آیا- میں نے کہا- میری شِکّی کہاں کھو گئی؟"

وہ شاید اس کا سشن جج خاوند تھا-

"توبہ، میں تو یوں سوگئی کہ ہوش ہی نہ رہا-" ایک خوابیدہ آواز ترنم ریز ہوئی- پھر یکایک وہ آواز جھجکی، جھنجلائی اور آہستہ سے بولی-" آپ ذرا چلے جایئے، ڈارلنگ- میں ابھی آتی ہوں-"

"لیکن سامان کہاں ہے، ڈارلنگ؟ چپراسی ڈھونڈ رہے ہیں-"

"آیا کے پاس کسی ڈبے میں ہوگا---توبہ آپ چلے بھی جایئے، میں ابھی آتی ہوں---"

"ذرا ٹھہرو، شِکّی---یہ بستر تو بندھوالیں-"

"ہائے میرے اللہ! بستر میرا نہیں ڈیئر- آپ ذرا چلے جایئے نا---"

"اوہو، ڈارلنگ، کیا بات ہے؟" جج صاحب حیران ہو رہے تھے- "میں نے کہا پھر بتاؤں گی- توبہ آپ جاتے بھی تو نہیں------"

غالباً جج صاحب پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے- وہ دیر تک کمپارٹمنٹ کے دروازے پر منڈلاتی رہی- میں نے غسل خانے کی دوسری کنڈی بھی اندر سے چڑھا دی---جب گاڑی چلی، تو میں نے غسل خانے کی جھلملی اُٹھا کر باہر جھانکا میرے رنگین سپنے صابن کے بلبلوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے پلیٹ فارم پر دو تین وردی پوش چپراسی سامان اُٹھوائے جا رہے تھے.. پیچھے پیچھے دونوں میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ دیئے خراماں خراماں چل رہے تھے وہ ہنستی ہوئی مٹکتی ہوئی جا رہی تھی- شاید وہ رات کے ڈرامہ کا ریہرسل سنا رہی تھی- جس میں ایک بے کس محبوبہ نے کسی جذباتی نوجوان کو خوب اُلّو بنایا اور اس کا

برتھ اور بستر دونوں چھین لئے---! دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی صبح میں بھی مجھے پسینہ آگیا- اور میں نے پانی کا نل کھول کر اس کے نیچے سر رکھ دیا-

بہت دیر کے بعد جب میں غسل خانہ سے نکلا تو کافی دن چڑھ آیا تھا- امریکی کرنل صاحب اپنے بستر پر بیٹھے صبح کی چائے نوش کر رہے تھے- میری سیٹ پر دو چینی ہوا باز اور ایک خان صاحب قسم کے کپتان بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ٹرنک پر ایک انگریز میجر رونق افروز تھے- میں نے اپنا بستر اُٹھا کے تہہ کرنا شروع کیا- تکیوں میں سے ایک مشام نواز مہک نکل کر سارے کمرے میں بکھر گئی- اور ایک نازک سا لمبا بال کالے ریشم کے تار کی طرح اڑتا ہوا کپتان صاحب کے اخبار پر جا لگا- انہوں نے اسے والہانہ عقیدت کے ساتھ انگلی پر انگوٹھی کی طرح لپیٹ لیا- میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکائے- اور پھر جھوم کر الاپنے لگے----

کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
صحرا قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب کا مالک

سب کا مالک کون
اللہ!
سب کا مالک کون؟
اللہ!
سب کا مالک کون؟

جمعرات کے جمعرات سندی گرام کی بستی میں وہ پگلا سا فقیر آیا کرتا تھا لوگ اسے سائیں بابا کہتے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اچھلتا، پھلانگتا، دوڑتا مچلتا اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر سب کا مالک کون؟ اللہ------ کا ورد کیا کرتا تھا۔ بچّے اس سے مانوس ہوگئے تھے۔ مائیں اس پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ گاؤں کے مکھیا لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ایک روز ننھی رضیہ ہاتھ میں سرسوں کے تیل کا کٹورہ اٹھائے جا رہی تھی، کہ اچانک ٹھوکر کھا کے گر گئی۔ تیل کا کٹورہ چھلک کر نالی میں جا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ اور دل میں خوف کے مرغولے لپکنے لگے۔ رضیہ کی ماں نے بڑی منّت سماجت کے بعد رشی کیش بابو کی بیوی سے دو آنے ادھار لئے تھے۔ بجرنگ لال بنئے نے بڑی مشکل سے دوّنی کا چھٹانک بھر تیل دیا تھا۔ رضیہ کا باپ کئی روز کے بعد دریا سے مچھلی پکڑ کے لایا تھا۔ رضیہ کی ماں چولھے پر ہنڈیا دھرے تیل کے انتظار

میں بیٹھی تھی۔ اب جو رضیہ نے دیکھا، کہ آدھا تیل اس کے کپڑوں میں، اور آدھا زمین پر لنڈھ گیا ہے، تو اس نے سارا زور لگا کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں دور سے سائیں بابا کی آواز آئی۔ رضیہ نے دوڑ کر اس کی انگلی پکڑلی۔ اور منّت سے کہنے لگی۔ "سائیں بابا، سائیں بابا۔ میرا تیل لنڈھ گیا ہے۔ ماں مارے گی۔ سائیں بابا تم سب کے مالک ہو، مجھے ایک دوّنی دے دو۔" یہ سن کر جیسے سائیں بابا کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے پھنکار کر ہوا میں ایک طویل جست لگائی، اور رضیہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ "سب کا ملک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟------ وہ چلّا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے رضیہ کے ہاتھ پر ایک دوّنی رکھ دی۔ جب رضیہ کے ماں باپ کو معلوم ہوا، کہ وہ سائیں بابا سے دوّنی مانگ کر تیل لائی ہے، تو مچھلی کا گوشت کانٹا بن کر ان کے حلق میں پھنس گیا۔ اور انہوں نے غصّے میں آکر رضیہ کے دونوں گال طمانچوں سے لال کر دیئے۔ شام کے وقت جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مسجد میں قرآن مجید کا سبق لینے گئی، تو مولوی صاحب نے کہا۔ آج مالک آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں فرصت نہیں۔ جاؤ۔"

"کس کے مالک مولوی جی؟" رضیہ نے پوچھا۔

"ہم سب کے مالک بیٹی۔ جا۔ تو نہیں جانتی۔"

"ہاں ہاں جی۔ میں جانتی ہوں۔" رضیہ کی آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک آگئی۔ "سائیں بابا جو کہتے ہیں کہ ہم سب کے مالک اللہ میاں------"

رضیہ کا فقرہ دانتوں کے درمیان کٹکٹا کے رہ گیا۔ مولوی صاحب نے ایک زنّاٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور ڈپٹ کر بولے۔" کافر کی بچی! دو سال سے پڑھ رہی ہے۔ ابھی اتنی تمیز نہیں آئی حرامزادی کو------"

رات کو جب وہ تاروں کی چھاؤں میں پلنگڑی بچھا کے لیٹی، تو دریا سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے تمتمائے ہوئے گالوں پر مرہم کا پھاہا سا رکھ دیا۔ خیالوں کے عجیب عجیب تانے بانے اس کے دماغ میں الجھنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگے۔ اس کا چہرا گویا فالتو تھا کہ جو دیکھتا تھا اس پر بے تکلف چانٹے جمارہا تھا۔ اسے اپنی بے پناہ مجبوری پر رونا آنے لگا۔ اور اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ اپنے روح کی ساری پنہائیوں کو اکٹھا کر کے آنکھیں میچ لے، اور دبی زبان سے کہے کہ اے ہم سب کے مالک، تو جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے، میری ایک بات سن لے------ نہ جانے اس کے دل میں کیا کیا شکوے تھے، کیا کیا فریادیں تھیں جن کو وہ اپنے خیالوں کی بھول بھلیاں سے کرید کرید کے نکالنا چاہتی تھی۔ لیکن مالک کے تصور نے اس کے تجسس کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان تازہ ہو کے ابھر آئے۔ رات کے سناٹے میں ایک میٹھا میٹھا سا ارتعاش اُٹھ رہا تھا۔ دور حویلی سے چھم چھم چھم، چھما چھم چھم چھم کی مدھم مدھم سی آواز آ رہی تھی، جیسے بہت سی تیتریاں اپنے پروں میں گھنگھرو باندھ کر پھولوں پر ناچ رہی ہوں۔ رضیہ نے چوری چوری گردن اُٹھا کر اپنے ماں باپ کو دیکھا جو آنگن میں تخت پوش پر لیٹے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے دل کو دھوکا دینے کے لئے چادر کا گول مول اور لمبوترا سا ڈھانچہ بنا کے چارپائی پر رکھ دیا اور دبے پاؤں باہر نکل آئی سُونی اور تاریک گلی میں اسے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن مالک کو دیکھنے کا حق اس نے بڑی محنت سے خریدا تھا۔ پے در پے طمانچوں کی سرسراہٹ اس کے گالوں میں ابھی تک آگ سی جلا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں بابا کے نعروں کی گونج تھی۔ مولوی صاحب کے لمبے لمبے وعظ تھے۔ مندر کی گھنٹیاں۔ تلسی کے بوٹے۔ نماز۔ روزے۔ نیاز مالک کے لئے، مالک کے نام پر، مالک کی راہ میں----- رضیہ کے دل میں مالک کا جو خلط ملط سا تصور تھا، وہ اسے اندھیرے اور سنسان گلی میں بھی روشنی دکھاتا لئے جا رہا تھا۔ اس کے شوق اور تجسس میں پیمبرانہ وارفتگی کا تناؤ آ گیا تھا۔ اگر دنیا میں ایک اور موسیٰ کے لئے جگہ ہوتی تو لاریب نندی گرام کی وہ تاریک اور ویران گلی کوہ طور کی بلند چوٹیوں کے ہمدوش اُٹھ جاتی-----

بڑی حویلی کے صدر دروازے پر اس نے رامانند چوکیدار کی منت کی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رامانند ایک لمبے سے بنچ پر لیٹا ہوا اُونگھ رہا تھا۔ سارا سال وہ بڑی حویلی کے اندر رہتا تھا، لیکن سال میں اک بار جب مالک لگان کا حساب کرنے آتے، تو صدر دروازے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ باغیچے میں پھولوں کی قطاروں کے درمیان مالک کا دربار لگا ہوا تھا۔ صدر میں مالک تھے۔ بائیں طرف مالک کے تحصیلدار، گماشتے، پیروی کار اور مصاحب تھے۔ دائیں جانب گاؤں کے مکھیا لوگ تھے۔ ان میں مولوی صاحب تھے، پاٹھ شالہ کے پجاری، سکول کے ماسٹر، دونوں سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال اور ایسے ہی چند ایک اور جو دن بھر میں دو کی جگہ تین یا چار دفعہ پیٹ بھر سکتے تھے۔ درمیان میں ریتا بوس تھی---اس کے پاؤں میں چھم چھم چھم، چھما چھم چھم چھم بجنے والے گھنگھرو تھے۔ وہ ایک پتلی سی سرخ ساڑھی پہنے شعلے کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سازندوں کی قطار تھی۔ چگی داڑھی والا طبلچی موٹا سا ہارمونیم ماسٹر، سوکھا ہوا زرد رُو سارنگی والا---ریتا اسی گاؤں کی چھوکری تھی، لیکن اب اس کا گھر کلکتے میں ہے۔ جب مالک آتے ہیں، تو گاؤں والے اسے پچیس روپے دن کے حساب سے چکا لاتے ہیں۔ ریتا کی ماں نندی گرام میں کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب اس کا چانڈو باز خاوند اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو سیٹھ بھائیوں بالا بخش بجرنگ لال نے اپنے قرضے کا تقاضا شروع کیا۔ دو سو روپیہ اصل زر تو ہر قسم کی جنبش سے بے نیاز تھا۔ لیکن پانچ روپیہ ماہوار شرح سود کے عوض دونوں بھائیوں نے اسے ماما بنا کر گھر میں ڈال لیا۔ زندگی کے اس الٹ پھیر میں جب ریتا پیدا ہوئی تو سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ساتھ سارے گاؤں نے یہ محسوس کیا کہ تلسی کے پودے میں ببول کا کانٹا اُگ آیا ہے۔ انہوں نے بیک آواز اس کانٹے کو گاؤں سے نکال دیا۔ لیکن کلکتے میں جا کر یہی کانٹے گلاب بن جاتے ہیں۔ اب ریتا کا بھی چرچا ہے۔ اور جب سیٹھ بھائیوں بالا بخش بجرنگ لال میں سے کوئی بیوپار کے سلسلے میں کلکتے جاتا ہے، تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے حساب میں عموماً چالیس روپے کی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

ریتا دادرے کی تال پر ناچ رہی تھی------

مالک کے سامنے ارغوانی بوتلوں اور گلاسوں کی قطار تھی۔ ہر سُریلے الاپ پر وہ پورے کا پورا گلاس غٹ غٹ کر کے چڑھا جاتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک موٹے سے پلندے سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور انگلی پر رکھ کر ریتا کی طرف ہاتھ نچانے لگے۔ ریتا کبوتری کی طرح پھڑپھڑاتی لپکی۔ مالک نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دونوں کے درمیان گویا آنکھ مچولی کا کھیل رچنے لگا۔ جس میں کبھی مالک کا ہاتھ ریتا کی سرخ ساڑھی کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا تھا کبھی ریتا کے گھنگریالے بال مالک کی بانہوں میں کھو جاتے تھے----اور جب وہ تھک گئی، تو اوئی کر کے اس نے اپنا سر مالک کے کندھے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کی پھیلی ہوئی توند تھپتھپانے لگی۔ مالک نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے گلابی ہونٹوں کے درمیان لٹکا دیا۔ سازندوں نے زور سے انترے کی تان اڑائی۔ اور ریتا کولھے مٹکا مٹکا کر، گردن گھما گھما کر ناچنے لگی------ پھر ٹھمری شروع ہوئی۔ چگی داڑھی والے طبلچی اور موٹے ہارمونیم ماسٹر نے ایک میلی سی چادر اٹھا کر محفل کی طرف تان دی۔ اور ریتا نے اس کی اوٹ میں کھڑے کھڑے اپنی لال ساڑھی اُتار کر سبز انگرکھا پہن لیا۔ عین اس وقت مالک کو زور کی انگڑائی آئی، اور وہ کھڑے ہو کر ایڑیاں اٹھا اٹھا کے جمائی لینے لگے۔ یوں بھی ساری مجلس کی گردنوں میں بے تُکے سے لوچ آ گئے۔ اور وہ اُوپر اُٹھنے لگیں۔ مولوی صاحب کن انکھیوں سے چادر میں کسی آوارہ چھید کو تلاش کرنے لگے۔ سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال نے ٹانگیں اٹھا کر زور سے ڈکاریں لیں۔ گماشتے اپنی مونچھوں کو بل دینے لگے۔ ریتا نے ننگی بانہیں سر پر رکھ کے اِدھر اُدھر دیکھا، اور آنکھیں مٹکا کر مسکرانے لگی------

مالک کی بوتلیں خالی ہوتی گئیں۔ نوٹوں کا پلندا گھٹتا گیا۔ چادر جلد جلد تنے لگی ریتا نے رنگا رنگی ساڑھیوں کے پھول کِھلائے۔ محفل پر ایک لطیف سا

سرور چھا گیا۔ رفتہ رفتہ مالک بھی ریتا کے گیتوں میں لقمہ دینے لگے۔ وہ گلا پھاڑ کر اس کی تان میں تان ملاتے، اور کبھی گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بدمست بھینسے کی طرح جھومنے لگتے۔ ریتا نے دیپک راگ گایا، پھر باگیشری ہوئی۔ پھر وہ بہاگ کے سُر پر ناچنے لگی۔ تین تال کی گت پر جھومتے ہوئے اس کی کمر یوں لچکتی تھی جیسے گلاب کی ٹہنی پر فاختہ بیٹھی ہوئی پھڑپھڑا رہی ہو۔ اس کے بال کالے ابرپاروں کی طرح پھیل گئے۔ اس کی بانہیں والہانہ طور پر کھُلنے اور بند ہونے لگیں۔ مالک کے ہاتھ سے گلاس چھن سے گر گیا۔ ان کے ہونٹ تھرتھرائے۔ اور وہ ایک زبردست جنبش کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ کمر اور دوسرا سر پر رکھ کے مٹک مٹک کر ناچنا شروع کر دیا۔ سازندوں کے ساز بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح تیز ہو گئے۔ ریتا کی بانہیں اور بھی سُرعت سے کھُلنے اور بند ہونے لگیں۔ اور پھر مالک نے جھپٹ کر اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا------

"سالا چور۔" رامانند چوکیدار کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس نے ہاتھ سے ہاتھ جوڑ کے ایک زبردست جمائی لی، اور آنکھیں مل کر مالک کی طرف دیکھا جو ریتا کو گلے میں ڈالے دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ پھر اس کی نظر رضیہ پر پڑی جو دروازے کے ساتھ سائے کی طرح لگی بیٹھی تھی----

"چل بھاگ، حرامزادی۔" رامانند نے اس کے مُنہ پر تڑاخ سے تھپڑ مارا۔ "شرم نہیں آتی، سُور کی بچی کو۔"

اس رات رضیہ کی نیند میں سونے اور چاندی کے گھنگھرو بجتے رہے۔ جب وہ جاگی تب بھی اس نے چاندی اور سونا ہی دیکھا۔ تخت پوش پر اس کا باپ رومال بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں اپنے میلے کچیلے زیور اکٹھے کر کے رومال میں ڈال رہی تھی۔ رضیہ کے ہاتھ میں بھی چاندی کے ہلکے ہلکے سے کنگن تھے۔ ماں نے چمکار کر اس سے کنگن مانگے۔ کیونکہ مالک کا لگان باقی اور آج ہی چکایا نہ گیا، تو شام تک ان کے گھر میں لال لال پگڑیوں والے گماشتوں کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھگڑا لگ جائیگا۔ رضیہ نے بہتیرا کہا کہ مالک کے پاس تو نوٹوں کے بھاری بھاری پلندے ہیں۔ اس کو ان معمولی کنگنوں کی ضرورت کیا؟ وہ روئی تھی۔ ماں نے دم دلاسا دے کر اس کے کنگن اُتار ہی لئے۔

"آنسو نہ بہا بیٹی۔" باپ نے اپنے آنسو روک کر کہا۔ "میں اس مہینے بہت سا دھان اکٹھا کر لوں گا۔ اور پھر تمہارے لئے سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔"

مہینہ بھر رضیہ کے دماغ میں سونے اور چاندی کے کنگن خواب کی طرح آتے اور جاتے رہے۔ اس کے باپ نے دن دگنی اور رات چوگنی محنت کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس من دھان جمع کر لئے۔ چاول کا بھاؤ روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ بالا بخش، بجرنگ لال کے دلال اور آڑھتی دھڑا دھڑ اونے پونے چاول اور دھان خرید کر جمع کر رہے تھے۔ آٹھ روپیہ من سے دس، بیس، پچیس، تیس، پھر پینتیس روپیہ من کا بھاؤ ہوگیا۔ لیکن کسانوں کے ذخیروں کی کنجیاں سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ہاتھ میں تھیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر بچائے ہوئے چاول اور لہو پسینہ ایک کر کے جمع کئے ہوئے دھان پانچ روپیہ من کے حساب سے اُٹھتے گئے۔ کچھ اصل زر میں کٹ گیا، کچھ سود میں لگ گیا۔ باقی بہی کھاتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا----اور جب گلی کوچوں میں نندی گرام کے ہنستے کھیلتے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر گرنے لگے، تو رضیہ کے کنگنوں کا خیال دو نوالے چاول بن کر اُبل گیا۔ بچوں کی پسلیاں چڑ چڑ کر کے اندر کی طرف دھنس گئیں، اور پیٹ غبارے کی طرح پھول کر ابھر آئے۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ سوکھ کر ڈھلک گئیں۔ جیسے چیلوں کے پنجے میں مردار گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے ہوں---- آدمیوں کا لہو ٹھنڈی آہیں بن کر اڑ گیا۔ کشوری چرن سارا دن چوراہے میں گرا ہوا دم توڑتا رہا۔ لوگ ناک پر کپڑا رکھ کے گزر گئے، راستہ کترا کے نکل گئے۔ کسی سے یہ نہ ہوا کہ اس کے سوکھے ہوئے گلے میں پانی کا آخری گھونٹ ٹپکا دے۔ ہیم لتا کی ماں نے بیٹی

کے کپڑوں پر تیل چھڑک کے آگ لگا دی۔ اور پھر اپنے گلے میں رسّی ڈال کر آم کے درخت سے لٹک گئی۔ ایک دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا، کہ رضیہ کا باپ جھونپڑی کے باہر اوندھا پڑا ہے۔ اور ایک بھوکا پیاسا گیدڑ اس کی ایڑیوں میں دانت گاڑے خرخر مُنہ چلا رہا ہے۔ رضیہ کے باپ میں ابھی ایک رمق جان باقی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں اتنا سہارا نہ تھا کہ وہ اس حریص درندے کے مُنہ سے اپنا پاؤں چھڑا لے۔ اس کے ہونٹ بھینچ کر دانتوں کے درمیان کٹ گئے تھے۔ اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دو گدلے سے آنسو بھرے ہوئے تھے جیسے بلّور کی گولیوں پر دھند کے بادل جم گئے ہوں------

ایک روز بجرنگ لال کا بھائی بالا بخش ان کی جھونپڑی میں آیا---ایک موٹی سے بہی اُلٹ پلٹ کے اس نے کوئی ساڑے پانچ من دھان کا حساب جوڑا۔ جو رضیہ کے باپ نے کسی وقت بیج کے لئے اُدھار لئے تھے۔

"بھاؤ تیس ہے۔" بالا بخش پان چبا کر بولا۔ "لیکن میں بیس روپیہ من ہی لگاؤں گا۔ کل 110 روپے نقد ہوئے"

پھر اس نے نظریں گاڑ کر رضیہ کی ماں کو پرکھا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اور پان کی پیک کا ایک بڑا سا گھونٹ غٹ کر کے نگل لیا۔

"تو فکر نہ کر۔" بالا بخش دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ "رضیہ کی ماں تیری عمر ہی کیا ہے---تو جب کہے گی بہی میں رسید چڑھا دوں گا، ہاں! لیکن بھیّا کو خبر نہ لگے!" بالا بخش نے آنکھ میچ کے مستقبل کا ایک لذیذ سا چٹخارہ لیا۔

دوسرے روز بالا بخش کا بھائی بجرنگ لال آیا۔ اس نے بھی ایک موٹی سی بہی میں ساڑے پانچ من دھان کا حساب کیا، اور تیس کی جگہ بیس روپیہ من کے دام سے 110 روپے نقد کی رقم جوڑی۔

"روپیہ سالا کیا ہے، رضیہ کی ماں" بجرنگ لال نے سرگوشی کی۔ "ساری بات تو دل کی ہے۔ تو چاہے تو سارا حساب کاٹ دوں۔ آپس کی بات ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلا بخش کو نہ بتائیو!"

تیسرے روز منہ اندھیرے رضیہ کی ماں نے ایک کندھے پر رضیہ کو اور دوسرے پر کپڑوں کی گٹھڑی ڈال کر اپنی جھونپڑی کو حسرت سے دیکھا، جس میں اس نے سہاگ کی پہلی اور آخری رات بسر کی تھی۔ ان دو راتوں کے درمیان ایسے لمحے بھی تھے جن کی دھڑکن میں اس نے زندگی کے میٹھے میٹھے نغمے جی بھر کے سُنے تھے۔ لیکن اب اس کا ساز بغیر سازندے کے تھا۔ وہ اندھیرے منہ اپنی ننھی سی کائنات کندھے پر اُٹھائے جا رہی تھی۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے آگے پیچھے ایک جہان تھا جو اُمڈ آیا تھا۔ ان میں بچے تھے جو بلکتے ہوئے جا رہے تھے، بوڑھے آدمی جو سسکتے ہوئے جا رہے تھے، عورتیں جو بکتی ہوئی جا رہی تھیں---کچھ مر گئے۔ کچھ لٹ گئے۔ لیکن جو چل سکتے تھے چلتے رہے جو رینگ سکتے تھے، وہ رینگتے رہے۔ اور ایک آسودہ منزل کا خیال ان کی گرتی ہوئی ہمت کو اُٹھاتا رہا۔ ان کی اُمیدوں کا کعبہ کلکتہ تھا۔ جہاں بڑے بڑے مکان ہیں، رنگ برنگی دکانیں، موٹے موٹے سیٹھ۔ جہاں کتوں کو گوشت ملتا ہے، بلّیاں دودھ پیتی ہیں۔ لوگ ناچتے ہیں---وہاں چاول بھی تو ہوں گے! نیم جاں ڈھانچوں کا یہ قافلہ ایک اسی اُمید کا سہارا لئے جا رہا تھا۔ ان کے تخیل نے کلکتہ کے اُونچے اُونچے مکانوں میں اور چمکیلی چمکیلی سڑکوں پر چاولوں کے بورے ہی بورے بچھا دیئے تھے، جو محض ان کے آنے کا انتظار کر رہے ہونگے! یہ ذہنی سراب ان کی ٹوٹی ہوئی کمر میں رستے باندھ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ رضیہ کبھی چلتی تھی، کبھی گرتی تھی، کبھی اس پر بھوک کا ایک گہرا اور طویل نشہ چھا جاتا تھا۔ نشہ شراب ہی میں نہیں نشہ عورت کی شرمیلی آنکھوں ہی میں نہیں۔ نشہ بھوک میں بھی ہے۔ ایک دھڑکتا ہوا خمار جو روح کی آزادی کو جسم کے احسان سے بے نیاز کر دیتا ہے! پیغمبر کا نشہ الہام بن جاتا ہے۔ صوفی کا نشہ بے خودی ہے۔ لیکن بھوکے کے نشے کو بیہوشی کہتے ہیں---خیر، بے ہوشی ہی سہی۔ لیکن رضیہ کے دماغ میں ہر وقت یہ اُمید تیرتی رہتی تھی، کہ شاید اگلے

لمحے کوئی اس کا منہ کھول کر مٹھی بھر چاول ڈال دے۔

رفتہ رفتہ افقی لکیروں پر اُونچی اُونچی چھتوں کے نشان ابھرنے لگے زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں بھٹکے ہوئے مہاجرین کے لئے یہ مدینے کے میناروں کی پہلی جھلک تھی۔ ان کی عقیدت کے پیمانے چھلکنے لگے۔ وہ قدم قدم پر گرتے تھے، اور ہر نئے موڑ پر ان کی اُمیدوں کا ہجوم پیچھا اُٹھتا تھا۔ اُمیدوں کا ہجوم ہی نہیں، کلکتہ کی چمکیلی سڑکوں پر وار تنگ گلیوں میں نیم جاں ڈھانچوں کا ہجوم بھی تھا، جو ہر لمحہ سیلاب کے پانی کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ "او ماں چاول او بابا چاول------او بابو چاول------"لیکن ماں کہاں تھی؟ بابا کہاں تھے؟ اور پھر وہ چاولوں کے بورے کیا ہوئے جو کلکتہ کی سڑکوں پر بکھرے ہوئے تھے؟ یہاں تو دروازوں پر دربان تھے۔ سڑکوں پر موٹریں---اور سپاہی! معلوم ہوتا تھا کہ حاجیوں کا قافلہ مکے اور مدینے کی تلاش کرتا ہوا قاہرہ کے شراب خانوں میں بھٹک نکلا ہے! یہ بھوکے اور پیاسے لوگ موت سے لڑتے آئے تھے۔ اب وہ زندگی سے لڑنے لگے۔ وہ نالیوں میں تیرتے ہوئے مونگ پھلی کے چھلکوں اور گوبھی کے پتوں کو نکال کر کھاتے تھے۔ وہ گندگی کے ڈھیروں کو کرید کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ وہ کارپوریشن کی کوڑے کرکٹ والی گاڑی پر چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ منہ نوچتے تھے۔ بال کھینچتے تھے---ان کی لڑائی کتوں سے ہوتی تھی، اور جب وہ نڈھال ہو کر سڑک کے درمیان گر جاتے تھے، تو لال پگڑی والے سپاہیوں کا دستہ انہیں ایمبولنس کار میں ڈال کر ہسپتال بھیج دیتا تھا۔

رضیہ کو کندھے پر ڈالے رضیہ کی ماں بھی ہسپتال جا رہی تھی۔ ایمبولنس کار میں بہت سی نڈھال عورتیں بچے اور مرد تھے۔ ان کے ننگے ننگے جسم پسینے میں شرابور تھے، اور وہ بے ترتیبی سے ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے جیسے گیلی گیلی نیم جان مچھلیوں کو چھکڑے میں ٹھونس کر بھر دیا ہو۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک کالا سا ڈاکٹر سفید سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ ہر اُونچی آہ، ہر بلند چیخ پر وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تلملا اٹھتا تھا۔۔۔"خاموش شالے۔ چھی یہ کالا آدمی چین سے مرنا بھی نہیں جانتا۔۔۔۔۔" اگر اس وقت رضیہ ہوش میں ہوتی تو اس کا حساس دماغ ضرور سوچتا کہ یہ اُلّو کا پٹھا کالا کس کو کہتا ہے؟ اس کا اپنا مُنہ کولتار کی طرح لتھڑا ہوا ہے۔۔۔۔۔"

ہسپتال والے بہت نیک تھے۔ وہ مرتے ہوئے لوگوں کو دودھ، کھچڑی، وٹامن، گلوکوس کے لالچ سے بچا لیتے تھے۔ اور پھر اسے انگلی سے پکڑ کے ہسپتال سے باہر چھوڑ آتے تھے، کہ جاؤ بیٹا ایک بار پھر مالک کی شان دیکھو۔۔۔ضرورت پڑے، تو ہمارا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے!

جب رضیہ اور اس کی ماں ہسپتال سے ڈسچارج ہونے لگے۔ تو نرس منازی نے رضیہ کو چاکلیٹ کا بنڈل اور ایک تصویر دی جس میں خداوند یسوع مسیح صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔

"تم مالک پر بھروسہ رکھو۔" نرس منازی نے تصویر چوم کر کہا۔

"ساری دنیا تمہارے سامنے ہے۔ خداوند مسیح تمہارا رہنما ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔

ڈلہوزی سکوئر کے وسیع چوراہے میں رضیہ ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھنا بھول گئی جن کی اینٹ اینٹ پر تاریخ نے انسانی انصاف کے بہت سے عجیب عجیب فیصلے لکھے ہیں۔ وہ اپنے مالک کو دیکھ رہی تھی جسے لوہے کے کیلوں کے ساتھ صلیب پر گاڑ دیا تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اس کے دل میں ایک زبردست جذبہ ترحم پیدا ہوا۔ وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگی، سائیں بابا پر، مسجد کے مولوی پر، نندی گرام کے زمیندار پر۔۔۔۔۔

رضیہ کی ماں نظریں گاڑے نرس منازی کی اس دنیا کو تلاش کر رہی تھی، جس میں سب کا رہنما خدا ہوتا ہے۔ چورنگی کے پاس ایک موٹا بابو اور ایک بھینگا بابو اس کے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے۔

"بھوکی ہو؟" موٹے بابو نے نکر کی جیب میں ہاتھ گھما کر کہا۔

"چلو۔ ایک ایک روپیہ دیں گے۔" بھینگے بابو نے آنکھ ماری۔

ایک شیشے کی طرح چمکتی ہوئی موٹر کا وردی پوش ڈرائیور ان کی طرف لپکا۔ "آؤ گوری تمہیں کلکتہ دکھلاؤں۔ یہ لو پانچ روپے پیشگی۔۔۔"

ایک ہوٹل کے گائڈ نے اس کی پسلیوں میں کہنی ماری۔۔۔۔"سوچتی کیا ہو۔ چلی آؤ میرے ساتھ۔ بیس روپیہ روز کما لوگی۔۔۔۔۔"

ایک رکشا والا اُسے پچاس روپے دلوا رہا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے گالی دی۔ ایک موٹا سیٹھ بے تحاشا اس کے ساتھ ٹکرا گیا۔ ایک خوبصورت نوجوان نے اس کی خوشامد کی۔۔۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ کلکتہ بھی بھوکا ہے۔۔۔ایک روپیہ۔۔۔پانچ روپیہ، بیس روپیہ، پچاس روپیہ۔۔۔۔۔ چاول کی طرح عورت کا بھاؤ چڑھتا جا رہا تھا۔ بھوکے پیاسے لوگ ہاتھ پھیلائے تڑپ رہے تھے۔۔۔ ہر جوان عورت کو دیکھ کر ان کے دل سے بے ساختہ فریاد نکلتی تھی۔ کہ او ماں، او بہن، او بیٹی، ذرا ٹھہرو۔۔۔۔۔

رضیہ کی ماں ان گرسنہ بھیڑیوں کے جنگل میں بھاگتی جا رہی تھی اور جب وہ چُور ہو کر ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ گئی، تو کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ ریتا تھی۔

"تم بھی آگئی ہو چچی؟" ریتا نے رضیہ کی ماں کے پاؤں چھو کر کہا۔

"اچھا ہوا مجھے مل گئیں۔ یہ بڑی بُری جگہ ہے چچی۔"

جب وہ ایک وکٹوریہ میں بیٹھ گئے، تو رضیہ نے پہلی بار اطمینان سے رنگ برنگی دکانوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ریتا کہہ رہی تھی۔ "میرے پاس عزت نہیں ہے چچی۔ لیکن مجھے دوسروں کی عزت کا پاس ہے۔" اس نے ایسی بہت سی باتیں کیں۔ بات بات پر اس کی کٹورہ سی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

ریتا کے چوبارے میں نندی گرام کے بہت سے بچے تھے، بہت سی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عورتیں بہت سے مرد----ان میں سائیں بابا بھی تھا- وہ ایک کونے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا- کبھی کبھی اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور وہ آہستہ سے کہتا تھا، سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟------

جب رات ہوئی تو ریتا نے گلابی ساڑھی پہن کر سنگار کیا- اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں پھول لگائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بیٹھک میں چلی گئی- اس کے گھنگھرو چھم چھم چھم، چھما چھم چھم چھم بجنے لگے، اس کی کمر سانپ کی طرح بل کھانے لگی- اس کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کی ناؤ تیرنے لگی------ زندگی کے اس دو دھارے میں ایک طرف سائیں بابا تھا- دوسری طرف ریتا بوس اور درمیان میں رضیہ تھی، جس کے ہاتھ میں ابھی تک مالک کی تصویر لٹکی ہوئی تھی------

ماما

دوسرے کمرے سے ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی- ماما اپنی کوٹھڑی کے دریچے میں بیٹھی ہوئی سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھی- وہ جتنی بار سوئی کے ناکے پر ٹکٹکی باندھنے کی کوشش کرتی، اس کی آنکھوں میں مکڑی کے جالے سے تن جاتے اور اس کو یوں نظر آنے لگتا جیسے ہوا میں رنگ برنگی پتلیاں سی گھوم رہی ہوں- صابن کے بلبلوں کی طرح سرخ سرخ، نیلے نیلے، سبز بھنور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے----اور پھر یکایک ایک عمیق اندھیرا چھا جاتا----ماما کے ہاتھوں میں بھی اب ایک کمزور سی کپکپاہٹ رہا کرتی تھی، اور کبھی تو وہ بیٹھے بیٹھے ہی پسینے میں شرابور ہو جاتی تھی------

اس نے سوئی اور دھاگے کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا، اور پھر اپنے کرتے کے دامن سے پسینہ پونچھنے لگی- اس کے بال ادھ کچے ادھ پکے ہو گئے تھے اور اس کے منہ پر جھریوں کے ساتھ ساتھ ایک میلی کچیلی پیلاہٹ سی چھا گئی تھی- جب اسے پسینہ آتا، تو اس کے چہرے کے موٹے موٹے مسام کھل کر ابھر آتے- اور پھر یوں نظر آنے لگتا جیسے کسی پھٹی پرانی مچھردانی کا ٹکڑا گدلے سے پانی میں بھیگ گیا ہو----

دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز مدھم ہوئی، اور ایک مترنم آواز نے اس کو بلایا----"ماما-"

ماما تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی- اس کے گھٹنوں میں ایک کمزور سی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کنکناہٹ ہوئی۔ اور پھر اس کی پنڈلیوں میں گویا چیونٹیوں کی ایک لمبی سی قطار رینگنے لگی وہ لڑکھڑائی، اور دروازے کا کواڑ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"ماما۔" اس مترنم آواز نے ذرا زور سے پکارا۔

"آئی ہوں بیگم۔" ماما نے جواب دیا، اور پھر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر ڈرائنگ روم میں گئی۔

بیگم نے ذرا غصے سے کہا۔ "اے ہے ماما، یہ کیا بات ہے؟ برسوں سے پکار رہی ہوں تم کو۔"

بجلی کی تیز روشنی میں ماما کی آنکھوں کے جالے کچھ مدھم پڑ گئے، اور وہ بیگم کے گالوں پر گلابی ڈورے سے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گئی۔ صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے، کہ غصے کے جوش میں بیگم کی دلکشی میں گلاب کھل جاتے ہیں!

بیگم نے ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ذرا نرمی سے بولی "دیکھو ماما، صاحب نے دفتر سے فون کیا ہے، کہ اُن کو چھٹی مل گئی ہے۔ اب ہم کل پہلی گاڑی سے دار جلنگ روانہ ہو جائیں گے----اُف، یہ گرمی" بیگم نے مخملی پُھرکے سے پیشانی مل کر کہا۔

"اللہ جانے آج اتنا امس کیوں ہے؟" بیگم کچھ نڈھال سی ہو گئی۔

"ذرا پنکھا تیز کردوں، بیگم؟" ماما نے دیوار پر لگے ہوئے سوئچ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں ماما" بیگم شکستہ سی ہو کر بولی۔ "یہاں ایک مصیبت کیا کم ہے پنکھا تیز ہو تو اس ریڈیو میں ہل چل مچ جاتی ہے----اللہ ماری گرمی کیا ہوئی مستقل دوزخ بن گئی۔"

"میں ابھی تازہ لیموں کا شربت لاتی ہوں بیگم۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"رہنے دو، ماما۔" بیگم نے کہا۔ "کوئی کہاں تک شربت پیتا جائے۔ گاڑی صبح چھ بجے چھوٹتی ہے۔ تم راتوں رات میرا سامان درست کر دو۔

صاحب کا کام بیَرا کرے گا۔"

"جی اچھا، بیگم۔"

"ایک ہی مہینہ کے لئے جانا ہے۔" بیگم نے لمبی آواز کر کے کہا۔ "زیادہ سامان لادنے پھاندنے کی ضرورت نہیں۔ کپڑے چھانٹ کر چمڑے کے سوٹ کیسوں میں ڈال دو۔ میں بھی ابھی آتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔"

"آپ زحمت نہ اٹھائیں، بیگم میں سب سنبھال لوں گی۔"

"نہیں ماما۔" بیگم نے نرمی سے کہا۔ "تم سے اتنا کام ہوگا، بھلا؟ میں ابھی آتی ہوں، تم چلو۔"

ریڈیو میں کوئی دھیمے دھیمے سُر میں ستار بجا رہا تھا۔ بیگم نے تھکے ہوئے انداز سے مخملی پُھرکا گالوں پر پھیرا، اور صوفے پر نیم دراز سی ہو گئی۔

ماما کی آنکھوں کے سامنے مکڑی کے جالوں کی بجائے اب رنگ برنگ کی ساڑھیاں، ریشمی دوپٹے، اور مخملی قمیضیں تھیں۔ جب اس کی انگلیاں کپڑوں کی نرم نرم، گداز گداز تہوں میں دھنس جاتیں، تو اسے ایک قسم کا سکون سا محسوس ہوتا۔ اور وہ سوچتی کہ بیگم کے چھریرے بدن پر جو گلاب کے پھول کی طرح ملائم اور مشکبار جلد ہے، اس کے لئے ایسے ہی نرم اور گداز کپڑوں کی ضرورت ہے----اور پھر اس نے اپنے کھدر کے قمیص کے دامن سے چہرے کا پسینہ پونچھا، اور شلواروں کی تہہ لگا کر صندوق میں رکھنے لگی----بار بار اٹھنے بیٹھنے سے ماما کی ٹانگوں میں کپکپی ہونے لگتی، اور جب وہ کسی بھاری صندوق کو زور لگا کر کھینچتی تو اس کے مُنہ پر پسینے کا سیلاب سا آ جاتا، اور بدن کی ہڈیاں ٹوٹے ہوئے ستار کے تاروں کی طرح جھنجھنا اٹھتیں----لیکن پھر یکایک کسی ساڑھی یا شلوار کی تہہ سے بیگم کے سینٹ کی بھینی بھینی لپٹیں نکل کر ماما کے دماغ پر نشے کی طرح چھا جاتیں----

"اوہو، ماما۔" بیگم ایک جوان مرغابی کی طرح تیرتی ہوئی کمرے میں آئی۔ "تم نے تو بہت سا کام سمیٹ لیا۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ صاحب آ گئے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ذرا ٹھہر گئی------"

"آپ جایئے نا، بیگم، میں سب کام کرلوں گی-" ماما نے ملتجیانہ کہا- وہ اپنے صاحب کو جانتی تھی، جو بیگم کے بغیر کمرے میں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر گھوم رہے ہوں گے-

"نہیں ماما-" بیگم نے پھر نرمی سے کہا- "تم یہ سب کام کیسے کر سکو گی بھلا؟ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں-"

بیگم ایک گدے والے دیوان پر بیٹھ گئی- اس کی نظر اپنے رنگ برنگے مکلف کپڑوں پر مچلنے لگی- ہر نئی ساڑھی، ہر نئے قمیص، ہر نئی شلوار کے ساتھ کسی چھوٹے سے رومان کی یاد تازہ ہو جاتی تھی- ننھے ننھے، معصوم سے رومان جو بیگم کی زندگی میں آسمان کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے- وہ اپنی سوسائٹی میں شمع انجمن کا درجہ پاتی تھی- اور اب یہ جوان شعلہ دار جلنگ کی رنگینیوں میں چمکنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا- دار جلنگ! بیگم نے مسرت آمیز شوق سے سوچا- اُونچی اُونچی شاداب پہاڑیوں پر پِک نِک، صبح سویرے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں گھوڑے کی سواری، چائے کی پارٹیاں، پُر تکلف ڈِنر، کلب کی خوش گپیاں---اور پھر بیگم خود رنگینیٔ محفل کی جان---- لیکن اُف گرمی! آج امس ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے، پنکھے کی ہوا بھی لُو ہو گئی- اور یہ ماما؟ معاذ اللہ، کیا مردہ دلی سے کام کر رہی ہے- ایک ہاتھ کمر پر ہے، دوسرے ہاتھ میں کپڑے اُلجھ رہے ہیں- بھلا ایسے بھی کام چلے گا؟ اور یہ گرمی! بیگم کو کچھ غصہ سا آنے لگا-

"سنو تو ماما-" بیگم نے اس کے ہاتھ سے کچھ کپڑے چھین کر کہا- "بھلا یہ اُونی شال تم کاہے کہ صندوق میں ٹھونس رہی ہو؟ آسمان سے آگ تو پہلے ہی برس رہی ہے-"

ماما نے شالیں اُٹھا کر الگ رکھ دیں-

کچھ گرمی کی وجہ سے، کچھ چڑچڑاہٹ سے بیگم کے چہرے پر پسینے کی

پھوار سی پڑ گئی- جیسے ہلکے گلابی رنگ کے بلّور پر دھند کی نمی چھا جائے! اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انگڑائی لی، اور جی چاہا کہ اپنی رعنائیوں پر خود ہی فریفتہ ہو جائے!

ایک، دو، تین------ ماما ریشم کے بلاؤز گِن رہی تھی- "دو درجن بلاؤز رکھ لوں، بیگم؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا-

"ہاں ماما رکھ لو" بیگم نے آئینے کے سامنے سے جواب دیا-

ماما بلاؤز گِن رہی تھی- اس کے جوڑوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں بار بار جھکنے سے اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ آ گئی تھی، اور اب اس کی سانس بھی پھول گئی تھی- وہ اکھڑی اکھڑی سی سانس----!بس ایک اسی سانس کے سہارے اس نے زندگی کے ساٹھ سال گزار دیئے تھے- ساٹھ طویل اور پیچیدہ سال- جو ایک دائمی اُلجھن کی طرح اس کے سامنے اُلجھتے گئے، اور وہ ایک بار بھی یہ نہ سمجھ سکی کہ اب کیا ہوگا؟ ہر روز جب آفتاب غروب ہوتا، تو وہ کسی موہوم سی، ناکام سی اُمید کا سہارا لے کر ایک نئی صبح کا انتظار کرتی، لیکن ایک سال، دو سال، ساٹھ سال---اس کے لئے وہی صبح رہی، وہی شام---اور یکایک اس کو اپنے ننھے ننھے دن یاد آنے لگے- جب وہ پیپل کے تلے آنکھ مچولی کی باری ہار جاتی تھی- اور جیتنے والے اس کے کندھے پر بیٹھ کر سواری کرتے! اور پھر وہ---سبزی کی ٹوکری اُٹھا کر بازار جانے لگی----اور پھر------ اور پھر------ یہ زندگی! یہ ساٹھ طویل اور پیچیدہ سال! وہی بوجھ، وہی تکان، وہی اکھڑی اکھڑی سانس------ ماما پر ایک تھکی ہوئی غنودگی سی چھانے لگی، اور اس کا سر جھکتے جھکتے جھک گیا-----

"ماما" بیگم نے کچھ نرمی سے کہا- "تم تھک گئی ہو؟"

"نہیں تو، بیگم-" ماما جلدی سے اُٹھی- "ابھی تو کام ادھورا ہے"

اور پھر اس نے مجرمانہ انداز سے بیگم کی طرف دیکھا---پیلی پیلی دھنسی ہوئی بے نور سی آنکھیں، پیشانی پر اُبھری ہوئی تیز رفتار رگیں، لٹکی ہوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھریاں موٹے موٹے مسام، ٹپ ٹپ گرتا ہوا پسینہ---اب یوں نظر آتا تھا
جیسے اس پھٹی ہوئی مچھر دانی کا چیتھڑا کیچڑ میں لت پت ہو گیا ہو---!

تِی، تِی، تِی----، ماما کی صورت دیکھ کر بیگم کو ابکائیاں سی آنے لگیں، اس نے جلدی سے اپنا معطر پھُرکا ناک پر رکھ لیا، اور دونوں آنکھیں زور سے بند کر کے بولی، "اے ہے، ماما، تمہاری صورت کیا بن گئی ہے؟ ذرا جلدی سے جاؤ، میری سنگار میز پر پاؤڈر کا ڈبہ ہے، تھوڑا سا اپنے چہرے پر لگا لو۔"

"پاؤڈر، بیگم؟" ماما حیران ہو گی۔

"ہاں ہاں، ماما" بیگم نے بے صبری سے کہا۔ "ذرا جلدی کرو، نا۔ میں کب تک آنکھیں بند رکھوں گی؟"

او، زندگی! او، خدا!!

اے موت!!!

اور جب ماما واپس آئی، تو یوں نظر آتا تھا جیسے سوکھی ہوئی دلدل میں کچھ مرجھائی ہوئی کلیاں بکھر گئی ہوں---!

بیگم نے ڈرتے ڈرتے، نیم باز آنکھوں سے ماما کی طرف دیکھا، اور پھر ایک اطمینان کا سانس لیکر بولی----"ہاں تو، ماما۔ ذرا جلدی جلدی کام کر لو، نا۔ صاحب کے کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے----"

اور پھر بیگم نے دیکھا، کہ اس کی اُونی شالیں تو ایک طرف بکھری پڑی ہیں! "اوہو، ماما" اس نے تنک کر کہا۔ "تم بھی عجیب ہو۔ یہ اُونی شالیں تو صندوق میں ڈالی ہی نہیں----ان کے بغیر دار جلنگ میں گذارہ ہو گا بھلا؟ اُونہہ، ماما!؟"

جال

اس کے قدم ڈگمگائے، وہ لجائی، لیکن پھر اس نے قینچی اُٹھا کر اپنے لانبے لانبے سیاہ بالوں کا ایک گھنا سا گچھا کاٹ ڈالا۔ اب جیسے نرملا کا دل ٹھنڈا سا ہو گیا۔ اور اس کی پہلی کپکپاہٹ اور جھجک دور ہونے لگی۔ وہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گئی، اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اپنی لمبی لمبی گھنگھریالی زلفوں کا انبار لگ گیا--- جیسے غصّے میں بپھرے ہوئے کالے کالے زہرناک سانپ اُلجھ پڑے ہوں۔ اس شام جب بوڑھا ماہی گیر گھر لوٹا، تو اس نے دیکھ کہ اس کا ٹوٹا ہوا جال درست ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی۔ لیکن جب وہ اپنے سکڑے ہوئے خشک ہونٹوں سے مسکراتا ہوا نرملا کی طرف بڑھا، تو یکایک اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کا ہاتھ جو پیار کے جھٹکے سے نرملا کے سر کی طرف اُٹھا تھا، ہوا میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اسے یوں نظر آنے لگا جیسے انار کے ٹمٹماتے ہوئے شگوفے پت جھڑ میں گر گئے ہوں۔ نرملا نے اپنی ساڑھی کا آنچل احتیاط سے سر پر اوڑھا ہوا تھا، لیکن کمر تک جھومنے والی ریشم ایسی زلفوں کی جگہ کون لیتا؟ ماہی گیر نے غیر ارادی طور پر اپنے جال کو اُٹھایا۔ اور اس کے ہاتھ ان جگہوں کو ٹٹولنے لگے جہاں نرملا کے نرم نرم بالوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک جال کو ٹٹولتا رہا جیسے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ وہ کچھ نہ بولا۔ وہ بولتا بھی کیا؟ وہ بول ہی کیا سکتا تھا؟ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ جال کئی روز سے ٹوٹا پڑا تھا۔ وہ روز جلی کٹی سناتا اور کہا کرتا کہ آج دنیا کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے بڑے ماہی گیر اپنا تانا بانا بننے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب اس کے جال کی مرمت کے لئے سُوت کہاں سے آئے؟ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ نرملا اپنے آبنوسی بالوں کو اس گندے سے، حقیر سے جال کے ساتھ پیوند کر دے---- سُوت کے دام اُونچے سہی، اس کی بساط سے باہر سہی----لیکن نرملا کی لہرائی ہوئی پیچدار زلفوں کی قدر کون پہچانے؟ ماہی گیر کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے----اور وہ لڑکھڑایا------ لیکن پھر اس کے دماغ نے ایک کروٹ لی۔ اور اُسے وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں وہ سنا کرتا تھا کہ دنیا میں ایسی سورما عورتیں بھی گزری ہیں، جو ٹوٹی ہوئی کمانوں میں سر کے بال باندھ کر میدانِ جنگ میں جان کی بازی لگا دیا کرتی تھیں----ماہی گیر نے اپنی دھندلائی سی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا۔ اور اُسے اپنی نرملا ایک ویسی ہی شیر دل، سورما سپاہی نظر آنے لگی، جو اپنے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کا جال بُن کر فاقہ مستیوں کو گرفتار کرنے نکلی ہو!

یہ کوئی پہلا روز نہ تھا، کہ نرملا کے چُولھے میں آگ نہ سلگی تھی۔ لیکن اب بڈھے ماہی گیر کو یقین سا ہونے لگا، کہ کائنات بھر کی مچھلیاں اس کے جال میں آنے کے لئے بے تاب ہیں۔ وہ پل کی پل میں آس پاس کے شہروں میں مچھلیوں کے انبار لگا دیگا۔ پھر اس کے ٹھنڈے چُولھے میں بھی آگ جلے گی۔ اس کی ویران جھونپڑی میں پھر دھواں اُٹھے گا۔ اور نرملا کے سوکھے ہوئے کمزور ہونٹوں میں جان آ جائے گی------ یہ سوچتے سوچتے ماہی گیر نے نرملا کی طرف دیکھا، تو اس کے خالی پیٹ میں ایک زبردست گھونسہ لگا۔ نرملا جھکی ہوئی چُولھے کی راکھ نکال رہی تھی۔ اس کی ساڑھی کا پلّو سر سے کھسک گیا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر کی آنکھوں میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اس کی نظر گویا گرم گرم راکھ میں جھلس گئی ہو۔ وہ جلدی سے اُٹھا، اور جال کندھے پر ڈال کر جھونپڑی سے نکل آیا۔

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔ بھوک کی تپش سے اس کے سمٹے ہوئے

پیٹ میں آگ سی جل رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اس کا دل غم اور غصّے کے جوار بھاٹے میں ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ نرملا دیر تک جھونپڑی کے دروازے سے لگی ہوئی اپنے بڈھے باپ کو دیکھتی رہی۔ جب وہ دریا کے کنارے پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں میں اوجھل ہو گیا، تو نرملا نے اپنی تھکی ہوئی آبدیدہ آنکھیں بند کر لیں----جیسے پھول کی پتی شبنم کے بوجھ سے جھک جائے۔ وہ دیر تک کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ شاید اس کے دماغ میں بھی سنہری مچھلیوں کے خوشگوار خواب تیر رہے تھے۔ شاید وہ بھی اپنے دل میں امید کے موہوم چراغ جلا رہی تھی------ یوں کھڑے کھڑے یکایک اس کو محسوس ہوا، جیسے کوئی سانپ اس کی ٹانگوں میں لپٹا جا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ جاڑو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اپنا سبز انگوچھا اس کی ٹانگوں کے گرد باندھ رہا ہے! نرملا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ مسکرائے، اور اسے بے اختیار ہنسی آنے لگی جیسے نسیمِ سحری کا ہلکا سا جھونکا افسردہ پھولوں میں جان سمو دے۔

"دہشت، جاڑو!" نرملا اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ "تو نے تو مجھ کو ڈرا دیا۔"

جاڑو ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مسکراتے وقت اس کے سفید سفید دانت تاروں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے، اور اس کی بڑی بڑی مستانہ آنکھیں لبریز پیمانوں کی طرح چھلک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح مسکراتے آئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا کیف سا، ایک گہرا سرور سا ان کی زندگی پر چھایا جا رہا تھا۔

"میں تو سمجھی کوئی زہریلا سانپ میری ٹانگوں کو جکڑ رہا ہے!" نرملا نے ایک پُر اطمینان سانس لے کر کہا۔

جاڑو کھلکھلا کر ہنسا، اور اس نے اپنا میلا سا انگوچھا پیار سے نرملا کے گالوں پر مارا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بھولی لڑکی، تم کیا جانو محبت کی بیڑیاں کس کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہتے ہیں!

"تم آج دریا پر نہیں گئے، چاڑو؟" نِرملا نے پوچھا۔

"اونہوں!" چاڑو مستانہ وار سرہلا کر بولا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سارے دریا میں ایک بھی ایسی مچھلی نہیں، جو تمہارے نرم نرم گداز بازوؤں کا مقابلہ کر سکے!

"آج تو دریا چڑھاؤ پر ہے، چاڑو" نِرملا نے ناریل کے درختوں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم کو تو ضرور جانا چاہیئے۔"

"اونہوں!" چاڑو اسی شریر انداز سے مسکرایا۔ اس کے سانس کی بڑھتی ہوئی گرمی کہہ رہی تھی، کہ دل کا جوار بھاٹا دریا کے اُتار چڑھاؤ سے کہیں زیادہ زور دار ہے!

"جال ٹھیک ہوا، یا نہیں؟" نِرملا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اونہوں! چاڑو نے اپنی شریر آنکھیں گھمائیں۔ "اب وہ جال ٹھیک نہ ہوگا نِرمل۔ سُوت کے دھاگے کچے جو ہوئے--- اُن پر بھروسہ کون کرے؟"

نِرملا نے ایک گہری اور لبریز نظر سے اس کو دیکھا۔

چاڑو مسکرایا۔ "تم مذاق سمجھتی ہو، نِرملا؟ تیری قسم، تیر وہ جو تیری پلکوں کی کمان سے نکلے۔ اور جال وہ جو تیرے لمبے لمبے، کالے کالے بالوں سے بنے۔"

نِرملا کے دل میں ایک زبردست ٹیس اُٹھی۔ وہ ہوا کی سی تیزی کے ساتھ جھونپڑی میں بھاگ گئی۔ چاڑو چوکڑیاں بھرتا اس کے پاس پہنچا، اور اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ "تم شرما گئی ہو، نِرمل؟ لیکن میری قسم، بولو میں نے جھوٹ کہا ہے؟ میں نے دریا کی مچلتی ہوئی لہروں میں ایک بھی ایسا بھنور نہیں دیکھا، جو تیری بل کھاتی ہوئی کالی زلفوں کا مقابلہ کر سکے--- مجھے جیون بھر اسی جال میں رہنے دو، نِرملا۔ مجھے کچے دھاگوں کے جال پسند نہیں۔ جو پل میں

ٹوٹیں، پل میں-----"

نِرملا کی آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی گھنی پلکیں آنسوؤں کے لُڑھتے ہوئے پرنالوں پر تھرتھرا رہی تھیں--- چاڑو مسکرایا۔ اس کو یوں نظر آتا تھا جیسے سیلاب کے روز لہروں کا جوار بھاٹا ماہی گیروں کے جال میں بھنور کھاتا ہوا آئے، اور چھلکتا ہوا نکل جائے!

"تمہیں رونا کیوں آگیا نِرملا؟" اس نے نِرملا کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا۔

باپُو کو گئے بہت دیر ہوگئی۔" نِرملا نے بات بنائی۔ "جا کر دیکھو تو کیا بات ہے؟"

"جال ٹوٹ گیا ہوگا!" چاڑو زور سے ہنس کر بولا۔ "اس میں رونا کاہے کا؟ کچے سُوت کے کچے جال-----"

چاڑو کا دبلا پتلا سڈول جسم تیز تیز چلنے میں یوں بل کھاتا تھا جیسے کسی گرتی ہوئی آبشار میں روہُو مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ نِرملا جھونپڑی کی دیوار سے پیٹھ لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک موہوم سا ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرز رہا تھا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی---ماہی گیروں کی اس چھوٹی سی بستی میں مہینوں سے بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ پہلے چھوٹے چھوٹے فاقے آئے۔ پھر چولھوں کی آگ سرد ہونے لگی۔ اور جب ہولے ہولے بوسیدہ جالوں کے تار بھی ٹوٹنے لگے، تو گویا بھوک سے تلملاتی ہوئی روحوں کے بندھن کھل گئے۔ اب کالی کالی گندی جھونپڑیوں کے دروازوں سے کراہتے ہوئے، بلبلاتے ہوئے، رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کی جگہ آزاد روحیں باہر نکلنے لگیں۔ جن کی پرواز کے سامنے زمین اور آسمان کی وسعتیں سمٹ گئی ہوں۔ نِرملا جب گلی میں گرے ہوئے بچوں کو سانس توڑتے ہوئے دیکھتی، یا جب وہ جلتی ہوئی چتاؤں میں سے چُرمُر چُرمُر کی بھیانک آواز سنتی، تو اُسے رہ رہ کر اپنے بڈھے باپُو کا خیال آتا، جس کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دھندلائی ہوئی آنکھیں روز روز اندر کو دھنستی جاتی تھیں۔ وہ کھانستا، تو اس کی ابھری ہوئی پسلیاں ٹھس ٹھس بجتیں۔ اور جب وہ پیپل کے پتے نمک کے ساتھ کھا کر اُوپر سے پانی کے دو چار گلاس پی جاتا، تو اس کے سکڑے ہوئے پیٹ کی لٹکی ہوئی جھریاں یوں بل کھانے لگتیں جیسے مرے ہوئے سانپ سورج کی گرمی سے تھوڑی دیر کے لئے رینگنے لگیں---- باپُو کہا کرتا تھا، کہ بیٹی، بڑھاپا تو سوکھے ہوئے دریا کی مچھلی ہے، جو آج نہیں تو کل تڑپ جائے گی۔
لیکن نِرملا کی کائنات میں باپُو کے سوا اور کیا سہارا تھا؟ وہ سوچتی، اور سوچ کے رہ جاتی۔ رات کے وقت ڈراؤنے خواب اس کی نیند میں ہڈیوں کے ڈھانچے ہی ڈھانچے بکھیر دیتے۔ دن کے وقت اس کا بوڑھا باپ ٹوٹے ہوئے جال کو کندھے پر ڈال ایک زندہ لاش کی طرح گھومتا نظر آتا----اور اسی سوچ میں جب نِرملا نے اپنی لہراتی ہوئی زلفوں کے تار کاٹ کر بڈھے ماہی گیر کا جال سنوار دیا، تو اس کے دل میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں، کہ اب اس کا باپُو رینگتی ہوئی، بلبلاتی ہوئی موت کے پھندے میں نہ آئے گا----- لیکن!

لیکن اب نِرملا کے دل میں ایک موہوم سا، ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرزنے لگا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی۔ اپنے بڈھے باپ کو بھی، جس کی ٹیڑھی ٹیڑھی پسلیاں یوں کٹکٹاتی تھیں جیسے سوکھے ہوئے پیڑ کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں----نِرملا کے دل میں ایک گہرے قسم کا احساسِ پشیمانی سر ابھارنے لگا۔ وہ اپنے وحشی اندیشوں کے گرداب میں پھنس کر کانپنے لگی۔ چاڑو کا ہلکا پھلکا سڈول جسم روہُو مچھلی کی طرح بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ نِرملا کے دل میں ایک پشیمان سی آواز کہہ رہی تھی، کہ بیوقوف لڑکی! تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سنہری جال کاٹ ڈالا۔ اب وہ نکل جائے گا، جیسے دریا کی مچھلی ٹوٹے ہوئے جال کے شگاف سے پھسل جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندگی کے اتھاہ سمندر میں ایسا کھو جائے گا، ایسا کھو جائیگا----- نِرملا کے مُنہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اسے اپنے بڈھے باپ پر غصہ آنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا، کہ وہ باپُو کے

ہاتھ سے جال چھین کر تار تار کر ڈالے۔ اور اپنے بالوں کی رسیوں کو اس سبک خرام روہُو کی کمر میں ایسے ڈال دے کہ وہ کبھی پھسل نہ سکے، کبھی منتشر نہ ہو------

چاڑو تیز تیز جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک آنچ سی تھی۔ ایک بے کیف، بے شرار سی آگ جو بغیر ایندھن کے چُولھے میں سلگ رہی ہو۔ لیکن جب اُسے نِرملا کا خیال آتا، تو وہ آگ گویا بجھ سی جاتی، اور اس کی زندگی پر ایک ہلکا سا سکون چھا جاتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لہروں کا شباب زوروں پر تھا۔ پانی کے اُونچے اُونچے ریلے آتے اور ساحل کی دیواروں سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے۔ موجوں کے تھپیڑے چھلک چھلک کر اٹھکیلیوں کا ساز بجا رہے تھے، اور ماہی گیروں کی ہلکی پھلکی نوکیلی کشتیاں لہروں کے تلاطم میں یوں جا رہی تھیں، جیسے پانچویں رات کا چاند بھورے بھورے بادلوں کے درمیان بھاگا جا رہا ہو---- لیکن چاڑو نے سوچا، کہ یہ تیکھی تیکھی کشتیاں تو نِرملا کی پلکوں کی طرح ہیں، جو چھلکتے آنسوؤں پر ڈگمگا رہی ہوں! اس کا جی چاہا کہ وہ نِرملا کے گالوں پر زور سے چٹکی بھرے اور اس کو ایک بار پھر رُلا دے---- سیلاب، کشتیاں، جال! وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔
اور پھر ہاتھ اُٹھا کر اس نے ہوا میں ایک طویل اور بلند بوسہ لے لیا!

آسمان پر ایک مٹیالا سا چاند ابھرا ہوا تھا۔ بڑھتی ہوئی شام کے سناٹے میں دریا کے تھپیڑے اور بھی بلند ہو رہے تھے۔ بڈھا ماہی گیر کنارے پر کھڑا ہوا جال کھینچ رہا تھا۔

"کہو چاچا، آج تو بورے بھر لئے تم نے؟" چاڑو نے پاس آ کر پوچھا۔

بڈھے ماہی گیر کے دانت اس کی پسلیوں کی طرح کٹکٹائے۔ اور اس نے خالی جال اُٹھا کر چاڑو کے سامنے پھینک دیا۔ نِرملا کے بالوں کے پیوند اُلجھ اُلجھ کر گچھے سے بن گئے تھے، اور ان کی لپیٹ میں صرف دو ننھی ننھی مچھلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماہی گیر نے دونوں مچھلیوں کو نکال کر زمین پر پٹک دیا۔ اور ان کو اپنی ایڑیوں کے نیچے دبا کر زور سے کچل ڈالا۔ اس کے سینے میں احساسِ ناکامی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ نرملا کے کالے بالوں کی کمند بنا کر آسمان کے تاروں کو نوچ نوچ کر پھینک دے!

"یہ کیا لے آئے چچا؟" جاڑو نے جال میں اُلجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "جالوں کے بال، یا بالوں کے جال؟" جاڑو ہنسا۔

ماہی گیر نے بتایا۔

جاڑو کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "تم دونوں بڑے بھولے ہو، چاچا۔ کہیں ہیرے کی کرن سے مٹی کے دیئے جلے ہیں؟"

ماہی گیر کچھ نہ سمجھا۔ اسے جاڑو کی مہمل سی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔

جاڑو دل ہی دل میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔۔۔بالوں کے جال! پلکوں کی کشتیاں!!! آنسوؤں کا سیلاب!!!۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے جال میں اُلجھی ہوئی کالی زلفوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر چوم لیا!

آیا

وہ تھی تو سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی، لیکن اس کے جسم میں جوانی کا تناؤ تھا۔ سول لائن کے حلقوں میں مسٹر رام لال کی آیا کا چرچا تھا۔ سرِ شام جب وہ پریمبولیٹر میں رام لال کے بچے کو بٹھا کے نکلتی تھی تو سول لائن کے افق پر گویا چاندنی سی چھا جاتی تھی۔ وہ بھی اپنے بدن کی مقناطیسی قوت سے بے خبر نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں بنگال کیمیکلز کا مشک بُو کوکونٹ ہیر آئل ڈال کے کنگھی چوٹی سے آراستہ ہو کر نکلتی تھی۔ ماتھے پر بندی۔ ہونٹوں پر مسز رام کی سنگار میز سے چرائے ہوئے لپ سٹک کی دھڑی۔ ناخنوں پر عنابی پالش۔ گردن میں خم، چھاتی میں ابھار۔ گالوں پر پاؤڈر۔ آنکھوں میں لگاوٹ۔ کوٹھیوں کے خانساماں باورچی خانے چھوڑ کر اس سے راز کی ایک بات کہنے سڑک پر آ جاتے تھے۔ مسترکموڈ کے پاٹ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا کر اس سے نیاز حاصل کرنے کی تلاش میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سفید براق وردیوں میں ملبوس بیرے جیبوں میں بسکٹ اور دل میں ارمان دبائے اپنی دیوی کا انتظار کرتے تھے۔ چمکیلی کاروں میں فراٹے بھرتے ہوئے دیدہ زیب، خوش لباس، دل پھینک بوڑھے اور جوان بھی اسے گھورے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ سول لائن کی کالی اور گوری میمیں اس سے جلتی تھیں۔ کالے اور گورے صاحب اس پر مرتے تھے اور ایک سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی آیا نے آراستہ بنگلوں اور پیراستہ کوٹھیوں کی اس دنیا پر رومان کی قوسِ قزح بُن دی تھی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۴ نمبر کی کوٹھی میں مسٹر رام لال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر رام ناتھ ۱۲ میں خان بہادر یوسف ۱۴ میں مسٹر چیٹر جی ۱۸ میں مسٹر نواب۔ باقی کوٹھیوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بدصورت تھیں یا پردے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید ابھی جوان نہ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے ہچکچاتے تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں انکا وجود یوں تھا جیسے زعفران کے کھیت میں سرسوں" یا شراب کے پیالے میں جوشاندہ، یا سیخ کے خستہ کبابوں میں ہڈی کے ٹکڑے! یہ کوٹھیاں سول لائن میں گم گشتہ مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دو کلمے دعا ہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کوٹھیوں میں خانساماؤں کو باورچی کہتے ہیں۔ بیروں کو خدمت گار اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ رات کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اُترتے تھے لیکن ان کے نغموں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے ننھے کی ریں ریں روں روں میں منتقل ہو جاتی تھی! ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا ایمان تھا۔ کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے تھے کہ خدا کی سلطنت میں بھی ڈاکو آباد ہیں۔ جو رنگ بھی چراتے ہیں، بھنگ بھی چراتے ہیں اور گندم کی سنہری خوشے بھی! جس کی لاٹھی اسکی بھینس۔ فرق تو سفید اور کالے تلوں کی قیمت میں بھی ہے پر انسان کی رنگت میں امتیاز کیوں نہ ہو۔ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ جس کی رنگت سفید ہو وہ کوئلے کی کان میں جائے ہی کیوں؟ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا! کوئلہ جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کشش تو ہیرے کی ہے، کوئلے کی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئلے کی کانوں میں زہریلی گیسیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتی ہیں اور جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تہہ میں سوئے ہوئے مردہ کیڑے بھی ایک بار کروٹ لیتے ہیں!

مسٹر رام لال کی آیا، آیا تھی تو کیا ہوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ خوبصورت تو تھی یوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی بھی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی۔ خوبصورت تو چیٹر جی کی بیوہ بہو بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حسین ہونے سے تو کائنات کی کنجی ہاتھ میں نہیں آجاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یہ ایک تھام لینے کا گُر تھا جو آیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پگھلے ہوئے جذبات کی بدرو میں بہتے ہوئے پانی کی طرح بہہ جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوشنما اور رنگین بنا کے دکھائے۔ آیا کا کمال یہ تھا کہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی عورت سے زیادہ پُرکشش تھی، خانساماؤں، بیروں، مہتروں کی بات دوسری تھی۔ وہ اپنی چڑچڑی، تھکن آلود، زرد رو بیویوں سے اکتا کر ایک ایسی دنیا میں پناہ لیتے تھے جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنگلوں میں بسنے والی دودھ کی طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور ریشم کی طرح نازک عورتوں کو اپنی بانہوں کے درمیان جھنجھوڑ دیتے تھے۔ مسٹر چیٹر جی کا خانساماں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ مسز چیٹر جی کے چمچوں، پیالوں اور گلاسوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر تر کر دیتا تھا۔ جب مسز چیٹر جی اپنے چمچوں سے پڈنگ کھاتی تھی، یا پیالوں سے چائے پیتی تھی، یا بلّور کے رنگین گلاس سے شیری کا پیگ نوش کرتی تھی، تو رمضان خانساماں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسز چیٹر جی کے عنابی ہونٹوں کو چٹاخ چٹاخ چوم رہا ہے!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پرتاب مہتر نے ایک دوسری طرح اپنی تنگیٔ داماں کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سولہ روپے ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمیٹنا پڑتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔ خان بہادر اور بیگم کے غسل خانوں میں جاتے ہوئے اُسے گھِن آتی تھی۔ بیر اور وسکی کے پس خوردہ بکارات، ذیابیطس کے ایلبیومن کی بدبُو۔ کروچن سالٹ کے فیض کا رد عمل---- وہ اس غیر طبعی ماحول کی عفونت سے گھبرا اٹھتا تھا۔ لیکن نعمت آراء کے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دل کی دنیا مہک اُٹھتی تھی۔ نعمت آرا خان بہادر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پکّے ہوئے آڑو کی طرح جوان۔ رام پرتاب کو نعمت آرا کے غسل خانے کی فضا میں گلاب اور چمپا اور موتیے کی سوندھی سوندھی خوشبو کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار ڈر کر صابن کی گیلی ٹکیا کو چھوتا تھا اور شرماتا تھا۔ کیونکہ کہ وہ نعمت آرا کے مشکبُو تن بدن کی آشنائے راز تھی۔ تولیے کی نرم نرم، تازہ تازہ نم آلودگی، اتارے ہوئے کپڑوں میں سلگتی سی آنچ کا احساس، نہانے کے ٹب میں پانی کے بلبلوں کی آنکھ میں سرودِ رفتہ کا خمار۔ رام پرتاب مہتر غسل خانے کی چٹخنیاں اندر سے بند کر کے نعمت آرا کے ٹب میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آرا کا گیلا صابن اس کی کالی کالی کھردری جلد کو اپنی ریشمیں اور مشکبار جھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس طرح مقناطیس کی رگڑ لوہے کے ٹکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح نعمت آرا کے تولیے کی رگڑ بھی رام پرتاب کے نحیف اور خمیدہ بدن میں پکّے ہوئے آڑوؤں کا رس بھر دیتی تھی۔ غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ تصوّر ہی تصوّر میں اپنے روئیں روئیں کو نعمت آرا کے مرمریں وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی ہمت بھی ہوتی تھی کہ وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر روز محمد ڈرائیور کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اور اپنی چھاتی کی ایک ٹکر سے اسے پچھاڑ کے رکھ دے!

روز محمد بڑا چابک دست ڈرائیور تھا۔ وہ بہت سی نازک اندام حسیناؤں کو پہلو میں بٹھا کر موٹر چلانا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کار کے کل پرزے بھی جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ انجن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی تھی اور خوف و ہراس، بیم و رجا اور بے بسی کے اس عالم میں روز محمد کے

مضبوط بازو سہمے ہوئے حسن کا سہارا بن جاتے تھے! عورتوں کے جسم پر بھی روز محمد ایک ہوشیار ڈرائیور کی طرح جچی تلی نظر ڈالتا تھا۔ چنانچہ اس نے دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے موڈل اور ان کی ساخت پر موزوں کئے ہوئے تھے۔ بیگم یوسف فورڈ ۱۹۲۸ تھی۔ مسز رام لال ماسٹر بیوک۔ مسز چیٹر جی کی بیوہ بہو سیکنڈ ہینڈ ٹورو۔ رائے صاحب کی لحیم و شحیم بیوی ہمبر کا کشادہ سیلون۔ کسی کو وہ ٹو میٹر کہتا تھا۔ کسی کو ریس کار۔ کسی کو بے بی آسٹن۔ اور آپا کا نام اس نے ٹیکسی رکھا ہوا تھا۔ سیٹی بجائی اور حاضر۔ میٹر کے حساب سے آٹھ آنہ فی میل کرایہ ہالٹ کا سوا روپیہ گھنٹہ۔ کبھی کبھار روپیہ آٹھ آنہ کی بخشیش۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جن کے پاس بیش قیمت گراں بہا کاریں ہیں۔ لیکن وقت بے وقت ان کو بھی ٹیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر۔ روز محمد کا فلسفہ تھا کہ دنیا میں صرف موٹر ہی نہیں چلائی جاتی، عورت بھی چلائی جاتی ہے۔ فقط چلانے کا سلیقہ چاہیئے اور چلنے کا بھی!

رات کے گیارہ بارہ بجے جب سول لائن کی دنیا پر گناہ و ثواب کے چتکبرے سائے چھا جاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دو جلسے بلاناغہ منعقد ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس روز محمد کی کوٹھڑی میں جمتی تھی! اس میں خانساماؤں اور بیروں، مسالچیوں، مہتروں اور ڈرائیوروں کی برادری کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں دیکھی اور دل کے کانوں سنی کہانیاں بیان کر کے روز محمد کی کوٹھڑی میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک خانساماں سناتا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے شامی کبابوں پر عنابی ہونٹوں کا ایک جوڑا بے طرح جھپٹا۔ ایک بیرا کہتا تھا۔ کہ کاک ٹیل کا جام بڑھاتے بڑھاتے اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخروطی انگلیوں کو چوم کر رکھ دیا ایک مسالچی کہتا تھا۔ کہ مصالحہ پیستے ہوئے اس نے پانی کی بجائے اپنی دہن کا لعاب ملا دیا۔ دزدیدہ محبت اور رومان کے یہ قصے روز محمد کے کمرے کی فضا کو معطر کر دیتے تھے لیکن پھر رام پرتاب مہتر اس رنگین ماحول میں گندے انڈے کی طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آٹپکتا تھا۔ عنابی ہونٹوں، مخروطی انگلیوں اور لذیذ گالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرا کے کموڈ کا قصہ لے بیٹھتا تھا۔ لیکن اس قصے میں بھی رس ہوتا تھا اور خانساماؤں بیروں، مہتروں، مسالچیوں کی یہ برادری باورچی خانوں سے لے کر پاخانوں تک کی چاردیواری میں اپنی جنتِ گم گشتہ کا سراغ پالیتی تھی۔

آپاؤں کی محفل میں رومانی قصے چلتے تھے وہ سر سے سر جوڑ کر رموزِ خودی اور اسرارِ بے خودی کی تفسیر گردانتی تھیں۔ وہ تو اپنی کوٹھیوں کے خلوت اور جلوت خانوں کی آشنائے راز تھیں۔ پرورشِ انسانی میں ان کا درجہ گویا ماں کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بالیدگی کے انوکھے گُر تھے۔ سنسار مالا کی طرح ان کی آغوش سب کے لئے وا تھی۔ بچے تو سکون پا کر ان کی چھاتی پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماؤں کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ آپائیں مسکراتی تھیں کہ چلو بیٹے خوش تو ہیں! چنیں ہوا تو کیا، چناں ہوا تو کیا! یوں بھی زندگی عزیز کی خاطر انہیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔ زبان کے چٹخارے کے لئے خانساؤں کی خوشامد نئے کپڑوں کے لئے دھوبیوں کی منت۔ ٹکے دو ٹکے کی ضرورت کے لئے مہتروں، مسالچیوں اور بیروں کی سماجت، نوکروں کے لئے تو خیر ان کا وجود من وسلویٰ سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے مالکوں کے لئے بھی وہ نعمت خانے کا ضروری جزو تھیں جنہیں وہ وقت بے وقت ذائقہ بدلنے کے لئے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی شکوہ یہ تھا کہ آپائیں آوارہ ہیں! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آپا پر پڑی۔ وہ نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پروائی سے بدن پر لپیٹے بیٹھی بال سُکھا رہی تھی۔ آپا کو دیکھ کر روز محمد ہارن بجا بجا کر ساون کے نظارے ہیں، گانے لگا آپا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر اسے غصہ سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "ہائے میری لاڈو۔ تیرے فیشن پر اللہ کی مار۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مرجائے گی تو جب دیکھو تالاب پر

نہارہی ہے۔ مجھے بتا تو سہی کیا ارادہ ہے تیرا؟"

"چل، روجم" آپا روز محمد کو روجم کہا کرتی تھی۔ "تو نے تو مذاق بنا رکھا ہے مجھے تو کسی فیشن کی لت نہیں اپنی ضرورت سے سر دھوتی ہوں۔ تم کیا جانو۔"

روز محمد نے ایک مشاق نظر آپا کے تن بدن پر دوڑائی۔ جیسے وہ موٹر کار کا ٹائر جانچ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آپا نے شرما کر دھوتی کا پلّو کمر پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مسکرایا۔

"آخر آگئی نا ریوڑی کے پھیر میں! کتنی بار کہا تھا کہ سنبھل کے چل۔ لیکن تجھ پر تو جوانی کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سالے کو باپ بتائے گی؟"

"باپ بتائے گی میری جوتی" آپا نے تنک کر کہا۔ "میں تو اس کی ماں ہوں گی اسے باپ کی کیا پروا؟"

اری چپ رہ۔ تو نہیں جانتی سالے کوٹھیوں والوں کو تجھے کان سے پکڑ کے نکال دیں گے۔ سور کے جنے گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چل تجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ جو سو پچاس خرچ آئیں گے میں دوں گا۔ تیری نوکری تو رہے گی میری لاڈو۔" روز محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈرائیوروں کی منڈی میں اسے سخی لٹیرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آپا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا اس نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا آگا پیچھا سوچا اور دنیا بھر کے بچے پالنے والی ماں کو خود اپنے بچے سے فرار کی کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح جب روز محمد کار دھونے کے لئے گیا، تو تالاب میں آپا کی لاش تیر رہی تھی---اب اسے ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تلاش

مایوس، غمدیدہ، بیزار---گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ میرا اپنا کوٹ ہے میں اس کوٹ کو سنبھال کر رکھوں یا پھاڑ ڈالوں۔ خود پہنوں یا بیچ دوں، یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دوں---مجھے کون روک سکتا ہے؟ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ۔

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنسان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اُجلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تمتماتے ہوئے سورج کے سامنے آورہ بدلیاں آ جائیں تو زمین پر ایک محدود سا سایہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بیوقوف آدمی! جوں جوں وہ سایہ

اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا۔ "گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔" گوراں نے کہا۔ "آجاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لئے بھٹک رہی ہوں۔" جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا۔ میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے، بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پا لیا تو وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمریں۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھناتا ہوا جسم عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے----

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کے گرجنے لگتا ہے "ابے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش۔ فرار۔ فلسفہ---میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو۔ جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں، تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ آدھ سیر پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤ، آلو، دو پیسے کے ٹماٹر---اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ مٹی گرم کر دے، اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں، تو میں سبزی منڈی میں جا کر لٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں- میں پر بھدیال کی دکان میں جھانکتا ہوں- کرتار سنگھ کے خوبصورت سٹال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گوبھی، مٹر، چقندر، سلاد اور اناس کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں- لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا- کبھی وٹامنز کے اجزاء میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں- اسی دھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں- میں جلدی جلدی کسی چھابڑی والے سے گلی سڑی سبزی ٹکوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں- بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے- میں خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں اور وہ حرامزادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے---کیا سمجھے بیٹا؟ میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ رہیے- میں نے ایک کو پھانس لیا- تمہارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں- دو ایک کو پھانسو اور عیش کرو---- ورنہ لٹکتے رہو گے بچو- جس طرح میں کرتار سنگھ کے شال پر لٹک جاتا ہوں------"

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا- جب کبھی وہ املی کے پانی سے بھرے ہوئے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا، اس کے ہونٹوں سے چار چار انگل لمبی رال ٹپک پڑتی تھی- اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبلا اٹھتا تھا- "ہائے ہائے، کیا خستہ گول گپا ہے---جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں!" چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نہ کوئی حسین حصہ نگل جاتا تھا! مس کلیانی کے ہونٹ، خالدہ کے دہکتے ہوئے گال، زرینہ کی حنائی انگلیاں------

ظہیر کہتا ہے "عورت شہد کی مکھی ہے- وہ زندگی کے خشک اور بے

کار چھتے میں رس بھرتی ہے- اس کے زہریلے ڈنک پر نہ جاؤ- اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو- تم نے نیلما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسپیچر کی خوبصورت بیوی- وہ پاپی اسی دفتر میں گمنام سا اُمیدوار تھا لیکن نیلما کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دیئے- آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر دام آگیا- اور دیکھتے ہی دیکھتے اندرسین چوبیس اُمیدواروں کے اُوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپیچری کی کرسی سنبھال بیٹھا---ہائے عورت کی نگاہ! میرے بھائی، اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں- تقدیریں بدل جاتی ہیں- نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے- ذوقِ یقین کا سودائی کون بنے- دنیا ہے تو عورت کی گود میں- عقبےٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں- میں دیکھتا ہوں کہ اب اندرسین ہیڈ کلرکی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیلما کی بلوری گردن میں اب پھر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں- خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کُود جاؤ---ایک بچاری ہیڈ کلرکی کیا چیز ہے، تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر دفتر کی ساری کائنات اندرسین کو سونپ دو----ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں---جیسے عمرِ خیام کی رباعی تھرک تھرک کر ناچ رہی ہو------"

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے- وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا- وہ عورت میں اس کا جسم ٹٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں، ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے-اسی پر بس نہیں- وہ جسم کی ہر رعنائی، حسن کے ہر پیچ، سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری نظر سے ناپ تول کے ان پر قیمتوں کے لیبل لگا دیتا ہے- نیلما کے گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلرکی ہے- صادقہ اس کی بیوی ہے لیکن ظہیر کہتا ہے- کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے- چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے- جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لئے ممی جان یا گلزار بیگم یا رتنابائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے- ممی جان، تین

روپے ---- گلزار بیگم، پانچ روپے۔ رتنا بائی، دس روپے، کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا تل ہے اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے۔

گوراں نے کہا۔ "آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔"

ظہیر نے سوچا، وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا۔ "مانگو کیا مانگتی ہو جانِ تمنا آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔"

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ "ظہیر صاحب، میں روز روپیہ کماتی ہوں۔ آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ لے لئے اپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں ---- ایک لمحہ کیلئے آپ گاہک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس یہ دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔"

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ اُلّو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا تھا۔ اُس نے زبردستی اسے بیس روپے دیدیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لئے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلاء منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل تل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی پشتہاپشت کی کیچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشکبار جلد کے نیچے بڑے

بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے! ---- میں نے کہا، گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی، تو میں ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا!

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مرجھا جاتا ہے ---- بلکہ سڑک کی طرح، جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا سٹیم رولر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر رینگتا جائے ---- پیدل چلنے والے جوتیاں چٹخاتے گزرتے جائیں۔ ٹم ٹم اور تانگے چیخ چیخ کرتے نکلتے جائیں۔ موٹریں گرد اُڑاتی بھاگتی جائیں ---- سڑک گھستی جائے۔ پتھر ٹوٹتے جائیں لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا سٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے ---- گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح جھکے ہوئے کلرک، موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے، سٹیم رولر کی طرح ہمکتے ہوئے موٹے موٹے سیٹھ، ---- یہ آئے، وہ گئے! یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے، وہ بھاگے! ---- اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی! گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی تھی۔ وہ زندگی کے نام پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھرڑ کھرڑ چلتی ہوئی پن چکی کو جاودانی سکون دے سکتے ہیں ----

ظہیر کہتا ہے۔ "عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس ٹپکاتی ہے۔" ظہیر بکتا ہے۔ وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا فلسفہ جماتا ہے۔ صادقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے سُور کہیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی نہیں، رس لیتی ہیں۔ رس چوستی ہیں۔ رس چراتی ہیں----بیگم ستار کی طرح، جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے----"آؤ بیٹا۔ میری ثروت سے ملو۔ ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔" اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور پتلا بلاوز اُتار کر رکھ دیتی ہے----یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں کہستان۔ یہ ہے ثروت کی لچکیلی کمر-----کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے: شرمیلی ثروت ایک، شرمیلی ثروت دو، شرمیلی ثروت تین----قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار! گوراں بھی یونہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آ جائے۔ حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی۔ ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھنچ جائیں گے اور غالباً انہیں وہ اُمید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مقفّل شبستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، نجمی، عفّت---- سب خوشگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین! بے حد حسین۔ ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جو نیلے نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسم----او میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسموں میں چاند اور سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کے رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمنّاؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے چمکیلی گاڑیاں۔ بھڑکیلے لباس----میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ نہ دے سکیں گی----

میں نے ظہیر کی خوشامد کی، کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے اسے میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں

ایک وہ میری مقدّس امانت ہے "مقدّس؟ ارے توبہ توبہ!" ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے----"تم نہیں جانتے گوراں کو۔ اس کے جسم میں اِتنے اِتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلتے ہوئے، زہریلے، مہلک کیڑے----تم مقدّس کہتے ہو، اس سڑتی ہوئی لاش کو؟"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ظہیر نے گرم گرم، سرخ سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی----اور اگلے روز وہ گوراں کو لے آیا۔ وہ آئی۔ جھجکتی ہوئی ہچکچاتی ہوئی۔ لجائی لجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو!

ایک دن میں نے کہا "گوراں، تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا تم اپنے بالاخانے کے پٹ مقفل کر کے رکھ دو۔"

گوراں حیراں سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔

"کیوں؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "گوراں، تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالاخانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تکمیل ہو اگلے مہینے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نُور کے سینے ٹوریم میں داخل کرا دوں گا۔ سینٹوریم کا بڈھا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے، وہ مٹ جائے گا------"

"تم سچ کہتے ہو۔" گوراں نے کہا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالاخانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آگیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ "تم اپنے بالاخانے سے اپنی روزی کا سہارا نہ لو، گوراں۔ کیا سچ مچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لئے کما رہا ہوں؟

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں۔ اس کا اُوپر والا ایک دانت کچھ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکایک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی احمری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکنے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی۔ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمریں۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھناتا ہوا جسم----

"تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔" وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ گوراں کی قیمت بیس ٹکے رات تھی۔ تم اُسے ساڑھے بارہ سو مہینہ پر چکا رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔" اس کے لانبے لانبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے گلدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے اُلجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے----گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رو رہی تھی----"تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔"

مایوس۔ غمدیدہ۔ بیزار---- گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی

ہے جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا---- خرید نے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں------

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دو رنگا

نام ضمیر، پیشہ انجینئری۔ لیکن عرفاً اسے دو رنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑ تھی۔ لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برص کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے اردگرد، آنکھوں کے پپوٹوں پر------ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے داغ تھے جن کے درمیان جا بجا اصلی جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے------ جیسے سمندر کے جھاگ پر کوئلوں کے ذرّے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اُسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلرکوں اور چپراسیوں تک ہی محدود تھا کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کپکپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔

دورنگی جلد، دو رنگا مزاج، قسمت بھی اس کی زندگی کو ہر پہلو سے دوغلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے ساتھ ایک سفید فام بھورے بالوں والی چھوکری بھی لیتا آیا۔ باربرا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں برتن دھونے پر ملازم تھی۔ اس قہوہ خانے میں برتن دھونے والیوں کی تعداد برتنوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں جوق در جوق قہوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام قحبہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے

ربا سادگی میں ہائے ہوز اور ہائے حطّی کا امتیاز ممکن نہیں ہے اس لئے جو قہوہ پینا چاہتے تھے، وہ قہوہ پیتے رہے۔ اور جو قہوے کی جگہ قہوے کے برتنوں سے دلچسپی لیتے تھے، وہ برتنوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ دو رنگا بھی دلچسپیوں کا عادی تھا۔ لیکن ایک دن یکایک اس کے برتن لبالب بھر کے چھلک اٹھے، اور برص کے سفید داغوں کی طرح باربرا بھی اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے لگ گئی۔

حادثات ہی تو ہیں!

جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک رنگی اور پختگی پر ایک عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا تھا----- نیو ہوسٹل میں ایک لطیفہ تھا، کہ دنیا کے مکمل ترین چاند گرہن کا حساب لگانا ہو تو کالج کے رجسٹر سے ضمیر کی تاریخ پیدائش نکال کے اس میں سے نو مہینے کے دن تفریق کر دو------ ! مذاق ہی مذاق میں لڑکے اسے اپنے بستر کی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھئی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی ٹپک گیا، تو داغ پڑ جائے گا! وہ دل ہی دل میں اپنی کلاس کی زیب النسا سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا، کہ اس کی محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک بار زیب النساء کے عنابی ہونٹوں کو چوم لے! وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا، کہ محبت کو سرمایہ دارانہ لالچ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیئے۔ خوبصورت عورت چلتا پھرتا نُور ہے۔ وہ سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک چھچھاتی ہوئی کرن زندگی کو سرشار کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیب النساء سے کہا کرتا تھا، کہ تو دنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پونجی ہے۔ اس میں میری محبت کا حصہ صرف اتنا ہے، کہ میں تیرے نازک اور خوں آشام ہونٹوں سے ایک چھوٹا سا لمس چرا لوں! زیب النساء نے کہا۔ "بہت خوب مجھے منظور ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یہ گارنٹی دیتے ہیں۔ کہ آپ کے ہونٹوں کا رنگ کچا نہیں ہے؟"------

لندن پہنچ کر ضمیر کے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں دورنگی علامات کا ظہور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شوق سے ویسٹ اینڈ کی ایک دکان سے ڈبل بریسٹ بلو کا بانکا سا ڈنر سوٹ بنوایا۔ یہ دوسری بات ہے، کہ اس سوٹ کی نمائش کے وقت اس سے ایک فاش، لیکن معصوم غلطی سرزد ہوئی۔ یعنی جب اس نے پہلی بار اپنا سیاہ ڈنر سوٹ پہنا، اس وقت دن کے ایک بجے لنچ کا ٹائم تھا! ------ شاید قدرت کو یہی منظور تھا، کہ ضمیر کی جلد کی سیاہی اس کی اجلی خواہشات کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس لئے ایک دن بیٹھے بٹھائے اس کے بدن پر برص کے بڑے بڑے سفید داغ نمودار ہونے لگے۔ قدرت فیاض بھی ہے اور بخیل بھی۔ بدقسمتی سے وہ ضمیر کے حق میں بخیل ثابت ہوئی کالی جلد پر سفیدی کا جو عمل جاری ہوا تھا وہ ادھورا ہی رہا۔ ضمیر کا اوپر والا ہونٹ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ لیکن نچلے ہونٹ پر دہی کی پھٹکیاں سی بکھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ جیسے وہ برفانی ہوئی نمکین لسی کا گلاس پی کر ہونٹوں پر زبان پھیرنا بھول گیا ہو! اگر زیب النساء لندن میں ہوتی تو وہ شوخ اور شریر لڑکی ضرور چلاتی------ "میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ تمہارا رنگ کچا ہے۔ جو لندن کے ایک ہی چھینٹے سے ڈھل گیا۔"

دوسرا حادثہ ایسٹ اینڈ کے قہوہ خانے میں پیش آیا۔ یعنی باربرا برص کے سفید داغوں کی طرح اس کی زندگی کے ساتھ چپک گئی------ اس نے دونوں مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے بہت سی جدوجہد کی۔ بہت سا روپیہ لٹایا۔ لیکن کوئی دوا، کوئی آپریشن اسے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا وہ شکست کو شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تاریکی میں روشنی کے نشان تلاش کرتا تھا۔ میری جلد؟ میری جلد زخم خوردہ ہے۔ ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں پٹرول ٹینک کو آگ لگ گئی۔ لپکتے ہوئے شعلوں نے چار انجن کی اس نایاب مشین کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک کر دیا۔ فرض کی انجام دہی ہر عالم میں لازمی ہے۔ پائلٹ کو بچاتے بچاتے میرا اپنا جسم جھلس کے دھواں ہو گیا۔ لیکن فرض آخر فرض ہے------ میری بیوی؟ میری بیوی لنکاشائر کے سر ولیم میکفرسن کی اکلوتی بھتیجی ہے۔ ان کے کارخانوں کی ململ دنیا بھر کی منڈیوں میں

کھپتی ہے۔ باربرا بڑی خوددار لڑکی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات پرائم منسٹر کی گارڈن پارٹی میں ہوئی------ کون حرامزادہ کہتا ہے وہ ایسٹ اینڈ کے قہوہ خانے میں برتن دھویا کرتی تھی؟------

جب وہ جہاز سے اترے۔ تو بمبئی کے تاج محل میں ان کی ملاقات راجکمار دلاور سنگھ سے ہوئی۔ وہ رنگا کار آزمودہ شکاری تھا۔ لندن میں اس نے بہت سے نرالے گُر سیکھے تھے۔ ایسٹ اینڈ والے کافی ہاؤس کا مالک قہوے کے ساتھ بسکٹوں کی جگہ جوان چھوکریاں بیچتا تھا۔ ویسٹ اینڈ لینڈ لیڈی مالدار مہمان پھانسنے کے لئے اشتہار کی جگہ اپنی خوبصورت لڑکیاں دیا کرتی تھی۔ دور نگے نے آتے ہی بنسلی کے ساتھ باربرا کا کھلتا ہوا بدن چپکا کر کنڈی دریا میں ڈال دی۔ دلاور سنگھ لالچی مچھلی کی طرح لپکا اور پھنس کے اٹک گیا۔ شمپین، وسکی، کاک ٹیل اور تاج محل ہوٹل کی بھڑکیلی رقص گاہ آدھی رات تک باربرا سفید ریشم کے لچھوں کی طرح دلاور سنگھ کی بانہوں سے لپٹی ہوئی ناچتی رہی۔ اگلی صبح یکایک راجکمار کو یاد آیا کہ اس کی ریاست کے لئے ایک قابل انجینئر کی فوری ضرورت ہے۔ دور نگے نے تجاہل عارفانہ برتا۔ "یہ ناچیز ملازمت کے اہل کہاں ہے کمار صاحب۔ اپنی طبیعت تو سیلانی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اور پھر یہ انجینئری تو وقت کاٹنے کا بہانہ ہے------ باربرا کے چچا سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں میں------ راجکمار دلاور سنگھ نے لنکاشائر کے سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں کی تفصیل بڑے انہماک سے سُنی اور پھر سوز و گداز کے ساتھ اپنی ریاست کی زبوں حالی کا نقشہ بیان کیا------ رعایا کی غربت پر لمبی لمبی آہیں بھریں۔ تجارت اور صنعت کی پستی کا رونا رویا۔ اپنے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی نااہلیت پر لعنت بھیجی۔ اور پھر ریاست کی ترقی کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ گھنے اور وسیع جنگل، تیز رو پہاڑی ندیاں، نیلم اور سونے کی چھپی ہوئی کانیں------ ہزاروں سال سے زمین کی چھاتی خزانوں کے انبار سنبھالے بیٹھی ہے۔ اگر مسٹر ضمیر چاہیں تو آسانی سے اس نایاب دولت کو بے نقاب کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ریاست کے لاکھوں بھوکے ننگے انسانوں کو مالا مال کر سکتے ہیں------ باربرا نے بھی کہا کہ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد اب یہی میرا وطن ہے۔ یہاں کی غلاظت اور پستی کو دور کرنا ہمارا انسانی فرض ہے------ اور اس وقت تاج محل ہوٹل کی بالکنی پر کھڑے ہو کر دس شلنگ ہفتہ پر جھوٹے برتن دھونے والی اور ساڑھے چار شلنگ رات پر بکنے والی چھوکری نے اپنا اخلاقی اور انسانی فرض بے باق کر کے رکھ دیا۔ اس نے راس کماری سے لے کر ہمالیہ پربت تک جتنے گندگی کے ڈھیر ہیں، اور گندگی کے ڈھیروں میں جتنے رینگنے والے انسانی کیڑے ہیں، ان سب کی نجات کا بیڑا اُٹھایا، اور مسٹر ضمیرالدین جلالی، احساس فرض سے مجبور ہو کر سرولیم میکفرسن کے کارخانوں کی جگہ سورج نگر کی ریاست میں انجنیئر بن گئے۔

"بے شرم ہے، سالا۔" رمضان علی اوور سیئر کہتا تھا۔ "اس سے تو اچھا تھا کوٹھے میں بٹھا دیتا اپنی ماں کو۔"

"بھئی عورت کیا ہے نری ٹیکسی ہے ٹیکسی۔" تیرتھ رام اکاؤنٹنٹ چٹخارے لیا کرتا تھا۔ "جہاں دیکھو چل رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں رفتار کا زمانہ!"

"سالے لنگور کی شکل تو دیکھو" خزانچند ڈرافٹس مین اپنے نئے انجنیئر سے بیزار تھا۔ "نقشوں کی الف سے ب تک نہیں آتی اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے ہم کو ماں کے خصم نے۔"

"جب دیکھو نشے میں گٹ ہوتا ہے، بہن کا یار۔ جہاں جاتا ہے۔ پہلے چھوکری مانگتا ہے------ میں نے کہا سنبھال کے رکھا ہوتا سالی ٹیکسی کو------" پنڈت بالک رام کو طیش آتا تھا۔

"ار میاں، ہٹاؤ قضیہ" مولوی تمیزالدین کا خیال تھا۔ "جو چھوکری دیتا ہے، وہ چھوکری لے گا بھی۔ لا حول ولا قوۃ لیکن یار، پاجی کا جسم یوں مہکتا ہے، جیسے------ تھو تھو تھو۔"

سارے دفتر نے کسی خیالی بدبو سے گھن کھا کر اپنی ناکوں پر رومال رکھ لئے! اصل میں دورنگے کے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی تیز سی سڑاند بسی ہوئی تھی۔ لندن کے بعد اس نے کھانے کے بعد کلی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور کموڈ کے بعد پانی کی جگہ ٹائلٹ پیپر کا استعمال جاری کر دیا تھا۔ ایک تو ہندوستانی موسم۔ دوسرے ہندوستانی معدہ۔ یہ روگ ٹائلٹ پیپر کے بس کا نہ تھا۔ چنانچہ دورنگے کا منہ اور پتلون ہمیشہ بڑے زور سے مہکا کرتے تھے۔

دو رنگا ریاست کی وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لئے باربرا کے لطیف لوچ میں اور بھی لطافت بھرنے کی ضرورت تھی اُسے ساڑھے سات سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اس حقیر سی رقم کے پس منظر میں سورج نگر کی کھلی ہوئی تجوریاں تھیں باربرا کے میک اپ کی قیمت تنخواہ سے پوری ہوتی تھی۔ اس کے لباس کا خرچ کمار کے تحفوں سے چلتا تھا اور دو رنگا؟------ دورنگے کا گزارہ رشوت پر تھا۔ وہ رشوت میں روپیہ بھی لیتا تھا، اور عورت بھی۔ اس کے دستخط آٹھ آنے سے لیکر پانچ ہزار تک بکتے تھے۔ اس کی رات سڑک کوٹنے والی پہاڑن سے لیکر کسی معتوب اور سیر کی سہمی ہوئی دلہن کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اگر عتاب کے نزول سے عورت یا روپیہ ملنے کی اُمید ہو، تو عتاب نازل کرنا بذاتِ خود ایک خوشگوار عمل ہے۔ ایک ہزار؟ وہ اپنے معتوب عملے سے مطالبہ کرتا تھا۔ ایک ہزار ممکن نہیں۔ بیوی؟ بیوی نہ سہی، بہو؟ ماں؟ بیٹی؟------ دورنگے کی نظر میں سؤر کے گوشت سے لیکر چیل کے انڈے تک سب حلال تھا۔ اور ایک روز جب امام بخش چپراسی کے سامنے زندگی۔ موت اور روزی کا مسئلہ درپیش تھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی نو برس کی محمودہ کو انجنیئر صاحب کے کمرے میں دھکیل دیا۔ محمودہ دیر تک انجنیئر صاحب کے منہ پر کالے اور سفید داغوں پر انگلی پھیر کے ہنستی رہی۔ اور پھر تالیاں بجا بجا کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگنے لگی۔

"آپاجی، تم ننگے ہو گئے میں ابا کو بتاؤں گی۔ آپاجی تم ننگے ہو گئے------"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دورنگے کے مچلکے میں روپوں کی بھری ہوئی تھیلی اور چھوکری کے بھرے ہوئے جسم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل سم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دو نوالوں کا دارومدار بھی ایک چھوکری کے کالے، پیلے، یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی جیب یا گود خالی رہ جاتی تھی۔ تو آسمان سے آنے والی روزی کا اک سورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دورنگے------بدبو سے مہکتے ہوئے دورنگے------کی نوکِ قلم نے قاضی عبدالقدوس، روڈ محرر کے رزق پر بندش کی مہر لگا دی، تو بچارے قاضی کو اپنی نمازیں اور اپنے روزے بے کار نظر آنے لگے۔ ان کی اُمیدوں کا آسرا خدائی مسند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اترتی ہے------اور اب جو انہوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت، گھناؤنا دورنگا انسان ان کے آب و دانے پر مطلق طور پر قادر ہے------ تو انہوں نے مُنہ پھاڑ اپنے خدا کو ایک فحش گالی دی۔

ایک روز دورنگا باغیچے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا، یکایک کوٹھی کے صحن سے پہلے گالیاں اور پھر چیخیں سنائی دیں وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خانساماں جمال خاں کچن کے پاس پڑا چیخ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا مہتر چیتے کی طرح سوار بیٹھا تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے پنجے جمال خاں کی گردن کو نوچ رہے تھے------ "سالا حرامی۔ ہماری مہریا کو تاکتا ہے؟ خون پی لیں گے سالے حرامی کا------" صحن کے کونے میں ایک کالی کلوٹی، بھینگی سی عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ دورنگا ہنسنے لگا، کہ یہ اُلو کا پٹھا مہتر آخر کس نعمت کے لئے یوں اکڑ رہا ہے۔ چڑیل ایسی صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے بڑھ کر مہتر کی پیٹھ پر کس کے ایک لات جمائی------ شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دورنگے کی چھاتی میں سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی باربرا یاد آئی۔ وہ شاید اس وقت کمار

بہادر کے ڈریسنگ روم میں نیم برہنہ اپنا میک اپ کر رہی ہو گی۔ کمار پلپلے دیوان پر لیٹا ہوا اسے ہر پہلو اور ہر زاویے سے جھانک رہا ہو گا۔ خیال ہی خیال میں ضمیر غصے سے بے تاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پھولی ہوئی گردن میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر جھکا کہ کمار کا گرم گرم خون چاٹ جائے------ اور عین اس وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات جمادی۔ یہ دورنگا تھا۔ دورنگا زور زور سے ہنسنے لگا------ ڈیم نان سنس! اُس نے جمال خاں کے سینے پر چڑھے ہوئے مہتر پر دو چار لاتیں اور کس کس کے مار دیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لئے اکڑ رہا ہے سالا! اگر ضمیر میں کچھ ہمت ہوتی، تو وہ ضرور جواب دیتا، کہ یہ سالا تو چڑیل کے لئے اکڑ رہا ہے لیکن تم اپنی پھول جیسی باربرا کے لئے کیوں نہیں اکڑ جاتے؟۔

آخر ایک دن دورنگا سچ مچ اکڑ گیا------ باربرا کے لئے نہیں اپنی ملازمت کے لئے۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ چند روز سے ایک گٹھیا کا مارا ہوا ساٹھ سالہ پارسی بڈھا اس کے دفتر میں دخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مسٹر باٹلی والا بمبئی کی کسی سیمنٹ کمپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ رہا تھا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سورج نگر میں سیمنٹ کے کارخانے قائم کرنے آیا تھا۔ ریاست میں لائم سٹون کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مسٹر باٹلی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس باٹلی والا کے سینے پر برفیلی چوٹیوں والے اُونچے اُونچے کہسار تھے۔ ان مرمریں چٹانوں سے اول درجے کا سیمنٹ کریدنا کوئی پیچیدہ عمل نہ تھا۔ دورنگا ریاست کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے اپنے ساتھ ایک خوشنما ریشم کا کیڑا لیتا آیا تھا۔ مسٹر باٹلی والا نئے کارخانوں کیلئے سیمنٹ کی پہاڑیاں اُٹھا لایا تھا۔ رفتہ رفتہ شہتوت کی ٹہنیوں کے سامنے مرمری چٹانیں سر اُٹھا کے جم گئیں، اور ایک روز مسٹر ضمیرالدین جلالی خرابیِ صحت کی بنا پر استعفےٰ دیکر لنکا شائر کے سرولیم میکفرسن کے کارخانوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دہلی آ گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا، کہ باربرا کو بجلی، پانی، بھاپ کے ایک خفیہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ راس کماری سے لیکر ہمالیہ پربت تک ہزاروں غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ اور ان ڈھیروں میں لاکھوں کیڑے رینگتے اور مرتے ہیں۔ وطن عزیز چھوڑنے کے بعد باربرا نے ایسے ہی کثافت کے گہواروں کی نجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مہربان طاقتیں بجلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی؟

جلترنگ

صبح سے اس کے دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح چڑمڑانے لگتا تھا۔----- وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا، لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلے کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جما نانبائی بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جما پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلے میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا تھا۔ گلی کے نکڑ پر اس کا تنور تھا، جس کے ماتھے پر "خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم" کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام تاج دین تھا، موقعہ و محل کے لحاظ سے جما پہلوان اسے خانساماں، بٹلر بوائے، تاجو، اور اُلو کی دم فاختہ کے مناسب القاب سے بلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھجا تھا۔ جس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے نیچے بہت سی ٹیڑھی ترچھی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ شہر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دیہاتیوں میں یہ جگہ بہت ہر دلعزیز تھی۔ کیونکہ جتو پہلوان صرف ۱۲/ آنے نقد کے عوض انہیں کھانے کے لئے گوشت اور چپاتی، سونے کے لئے ایک چیں بجیں چارپائی اور مقدمہ لڑنے کے لئے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوئی اسامی کے لئے پہلوان بڑی چابکدستی سے اپیل دائر کرنے کے ٹوٹکے، گرمیوں میں دہی کی لسّی، اور سردیوں میں چائے کے ساتھ پراٹھے تیار رکھتا تھا۔ جیتنے والوں کے لئے تاج دین خانساماں مرغ ذبح کر لیتا تھا یا پلاؤ اور قورمے کے ساتھ شامی کباب بنا لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر خوش لذیذ ہوٹل کے نرخ ذرا بے لذت حد تک اُونچے چڑھ جاتے تھے، لیکن اگر ڈوبتی ہوئی اُمیدوں کو تنکے کا سہارا مل رہا ہو۔ اور بلّیوں اچھلتے ہوئے دل کے سامنے عین موقعہ پر بھنا ہوا مرغ اور کرارے کرارے شامی کباب رکھ دیئے جائیں، تو وکیلوں، مختاروں، پیش کاروں اور کلرکوں کی زد سے بچے ہوئے چند حقیر ٹکے یاروں کے یار جتو پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا؟

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط سی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جتو پہلوان تکیہ لگائے میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کے لئے آس پاس لکڑی کے بنچ اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے دل میں کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا، کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا، شاید کبابوں میں مرچ زیادہ ہو، شاید قیمے میں نمک کم ہو------ اس لئے وہ ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد اپنے خانساماں بٹلر یا بوائے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پیالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا، کہ "پہلوان ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بِکری کے لئے خاک چیز بچے گی؟

"ابے چل کہیں کا، اُلّو کی دم فاختہ نہ ہو------" پہلوان اپنے چوڑے سینے پر ہاتھ مارتا تھا------ "جان ہے تو جہاں ہے پیارے تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سالے؟ آیا بڑا ہوٹل کا مالک"۔

مالک تو جو ہو سو ہو، لیکن خوش لذیذ ہوٹل کو لذیذ رکھنا تاج دین کا فرض تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی کے لئے وہ بھی عموماً دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سالن اور کبابوں کا نمک چکھ لیا کرتا تھا۔ خادم قوم اور خادم ہوٹل اور نوکر کی فرض شناسی کا سارا نزلہ بچارے مسافروں پر گرتا تھا۔ لیکن جتو پہلوان کا مربیّانہ برتاؤ۔ اور حکیمانہ چرب زبانی کبھی کسی کو یہ محسوس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوٹیوں کی جگہ پیاز کی بڑی بڑی گنٹھیاں تیر رہی ہیں اور کبابوں میں قیمے سے زیادہ بیسن کی ملاوٹ ہے!

شام کے وقت جب خالد سکول کے کھیلوں سے لوٹتا، تو جتو پہلوان اسے آواز دے کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا------ "آؤ بیٹا خالد بابو------ ارے او تاج دین ایک پلیٹ میں مصالحہ دار بھنی ہوئی بوٹیاں تو لاؤ ذرا۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے------" اور جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا چٹخارہ ختم کر لیتے تھے تو روزنامہ انقلاب کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فرفر اخبار سناتا، اور جتو پہلوان لیٹے ہی لیٹے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہیدانِ طرابلس کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کے لئے رضاکاروں کی ایک ٹولی کیساتھ بمبئی کلکتہ اور حیدر آباد کی طرف گھوم آیا تھا۔ اس لئے وہ بین الاقوامی معاملات پر رائے زنی کرنا اپنا عملی حق سمجھتا تھا۔ آگرہ کے پچھم میں چین کا بادشاہ بمبئی کے پاس ہانگ کانگ کا ملک، انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدانِ جنگ جتو پہلوان کے تبصرے میں تین چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ خالد کو کبھی کبھی اس بے تکی لاف زنی پر ہنسی آتی تھی۔ لیکن پہلوان کو ٹوکنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ صرف جتو پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اڑانے کا مزا کرکرا ہو جانے کا ڈر تھا، بلکہ پہلوان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظر میں اس کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ خالد مناسب طور سے پہلوان کی باتوں میں لقمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا------ "سباش، بیٹا خالد بابو۔ خوب علم کما رہے ہو------ جلدی جلدی کالج کر لو، بیٹا ڈپٹی کمشنر بن کے رہو گے------ ہاں، جتو پہلوان کی بات پتھر پر لکیر ہے------ ہاں!" ڈپٹی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لئے حقے کی نے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے دل میں خفیہ سے ارمان اٹھتے تھے، کہ وہ کسی روز اپنے بیٹوں کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے، لیکن کون جانتا ہے کہ یہ ملاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آ جائے! "پتا پر پوت، گھوڑے پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" جتو پہلوان کہا کرتا تھا۔ کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے شاباش میرے شیر! جلدی جلدی کالج کر لو بیٹا خالد بابو------"

جتو پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سن کے خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے پچھم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے حادثے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیر سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لئے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو، وہاں ممانی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آ کر اس کا منہ نوچ لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی------ اور اگر ممانی سے پٹتا

تھا، تو غریب خالد۔ ----۔ ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیٹے ہوئے تھے بیس تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بات پر الجھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اسے گردن پر کاٹ کھایا۔ خالد کی قمیص خون سے لتھڑ گئی، اور وہ شاید پہلا موقعہ تھا جب ممانی نے خالد کے لئے عزیزہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا سا نشان اب تک نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید یہ بچپن کے دبے ہوئے نقوش تھے، جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک عزیزہ کے لئے ایک مبہم سی بے اعتنائی ڈر اور شاید نفرت کا ملا جلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت عمیق سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ اور حتی الوسیع اس کی موجودگی میں ہنسنے اور بولنے سے احتراز کرتا تھا۔ لیکن عزیزہ ایسی نہ تھی۔ وہ خالد کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن خالد رکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ عزیزہ اس کے کپڑوں پر استری کر دیتی تھی، کمرے کی چیزیں قرینے سے سجا دیتی تھی۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا تھا تو سر دبا دیتی تھی، اگر فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آ جاتی تھی، تو اس کی رضائی میں بیٹھ کر گھنٹوں پاؤں دباتی رہتی تھی------ ایک روز ممانی پڑوس کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ خالد انفلوئنزا کے شدید بخار میں مبتلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دبایا، بازو دبائے، کمر دبائی، گھٹنے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ بولی، "میں ایک ترکیب کرتی ہوں خالد۔ تم سیدھے لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے سارے جسم پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہوں۔" عزیزہ نے اپنے بھرپور جسم کے سارے گداز کو خالد پر مسل ڈالا۔ لیکن اس کے درد میں کمی نہ ہوئی۔ عزیزہ لاکھ کہتی رہی، کہ ذرا ٹھہرو۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے لیکن وہ جھنجھلا کر اٹھا، اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پلنگ پر جا لیٹا------

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ سکول میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر تک آم کے پیڑوں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب کئی روز سے کمپنی باغ نہ جا سکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اُسے نکسیر آ جاتی تھی۔ ممانی کا خیال تھا، کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے لئے اس نے خالد کو گاجر کی کلونجی بنا دی تھی، اور صبح شام تازہ مکھن میں کالی مرچ اور کدو کے مغز ملا کر اسے چٹا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کو دو بار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا ہو------

اس نے بیزار ہو کر تولیہ کندھے پر ڈالا، اور غسل خانہ کی طرف چلا دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسکین ہو۔ لیکن غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ بھی کوئی نہانے کا ٹائم ہے بھلا۔ وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا گھوما، اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک درز سے اندر کی طرف جھانکا------ جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اور بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا۔ ٹھٹکا۔ جھکا۔ اور چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک بار پھر جھانکا------ گھوما، پھرا، ہچکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں درز کے ساتھ جم کے رہ گئیں، جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے چمٹ جاتے ہیں!

وہ عزیزہ تھی۔ وہ جگمگاتے ہوئے موتی کی طرح صدف سے باہر نکلی کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دبیز پردوں سے باہر نکل آئی ہو------ اس نے اپنے گھنے بادل کی لٹوں کو کھولا، اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے انبار چھوڑ بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے، اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی لی۔ خالد ڈرا، کہ شاید زلزلہ آ جائے گا------ اور

سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر ٹوٹ جائیں گے! آگرے میں محبت کا ایک مرمریں خواب سویا ہوا ہے۔ آگرے کے پچھم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے------ لیکن آگرے کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برفیلی چوٹیوں کی طرح دمکتے ہوئے کوہستان------ ہمالیہ کی چھاتی پر بنائے ہوئے بلّوری مینار------ عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گردن کو زور سے جھٹکا۔ برسات کی کالی گھٹائیں بکھر کر پھیل گئیں۔ بارش کی پھوار فضا میں جھلملانے لگی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس میں لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھونکیں مارنے لگی۔ وہ جھولتا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر جڑے ہوئے شبنم کے موتی کو نسیمِ صبح تھپیڑے مار رہی ہو------ اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا، تو عزیزہ نے جھک کر اسے اپنے ہونٹوں کے درمیان دبوچ لیا------ وہ نہا رہی تھی۔ پانی کی لہریں پہاڑی چشموں کی طرح اپنا جلترنگ بجانے لگیں۔ تاج محلوں کے دامن میں جمنا کے سیمابی دھارے بہنے لگے۔ کوہساروں پر کہکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ میدانوں پر قوسِ قزاح کے فوارے سے چھوٹنے لگے------ یہ مچلتا ہوا سیلاب کہاں جا رہا ہے؟ اس بے پناہ طوفان کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی؟------ خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم جیسا لوچ آ گیا۔ وہ دمبدم دیوار کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحے وہ جھپاک سے اندر جا گرے گا------ گرتے گرتے اس کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں دم بھر کے لئے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہوا لٹو کی طرح گھوم رہا ہے------ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں، اور جلدی سے تولیہ اٹھا کر اپنی خشک ناک پر رگڑنے لگا------ اسے شک ہوا کہ شاید نکسیر پھر بہہ رہی ہے!!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاگی

فریدہ بدنام ہو گئی تھی- ڈاگی پر لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے، یہ بات نہیں کہ وہ گلی کوچے میں جوان چھوکروں کے ساتھ آنکھیں لڑاتی تھی- نہ یہ کہ اندھیری رات میں اس کے چور دروازے کے آس پاس کوئی پُراسرار یار منڈلایا کرتا تھا------ بلکہ فریدہ تو محلّے کے دل پھینک جوانوں کے لئے انگوروں کا گچھا تھی- جو پکے ہوئے رس سے چھلکنے کے باوجود بھی ترش تھے! بڑے بڑے بانکے ترچھے گبرو اس کے سامنے کنّی کترا کر نکل جاتے تھے- فریدہ ان کے دل پہ راج کرتی تھی- لیکن وہ اپنی رانی کو پس پردہ پوجتے تھے- کھڑکیوں، دیواروں، اور چھتوں کی اوٹ میں بیٹھ کر وہ گھنٹوں فریدہ کے دیدار کا رس نگاہوں کے راستے چوستے رہتے تھے- چلمن کی آڑ میں فریدہ کی چوڑیوں کی ایک کھنک یا اس کی لرزتی ہوئی آواز کا ایک سُر آس پاس کے جوانوں کی نس نس میں کڑکتی ہوئی بجلیاں چھوڑ دیتا تھا- فریدہ کے خیال ہی خیال سے ان کے خون میں آتشبازی کے انار چھوٹنے لگتے تھے- اور لذتِ احساس کے شدید جھٹکے انہیں ربڑ کی گیند کی طرح چپکا چپکا کر نڈھال کر دیتے تھے- لیکن اگر کبھی وہ کوٹھے کی منڈیر پر یا گلی کے نکڑ پہ اچانک کسی کے سامنے آجاتی تھی، تو جوشیلے شکاریوں کی تنی ہوئی کمانیں ڈھیلی پڑ جاتی تھیں- انکے ترکش میں تیروں کی قطاریں درہم برہم ہو جاتی تھیں- جنگلی ہرنی انکے سامنے کوکڑے لگاتی گزر جاتی تھی- سانس پھلا کر اپنے سینے کا سارا ابھار شکاریوں کے نشانے پر آویزاں کر دیتی تھی- لیکن

کوئی تیر ایسا نہ ہوتا تھا جو اس کی چھاتی میں تَن سے پیوست ہو جائے، شکاریوں کی چھریاں کند تھیں- ان کے دست و بازو لرزاں تھے- وہ شہر کی منڈیوں سے کٹا کٹایا گوشت خریدنے کے عادی ہو گئے تھے- ان میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ جنگل میں آہوئے وحشی خرام کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں!

فریدہ جوان اور خوبصورت ہی نہیں تھی- وہ جوانی اور خوبصورتی کے احساس سے لبریز تھی- لبالب بھرپور- شراب کی صراحی کی طرح، جسے ساقی کی انگلیوں کی ہلکی سی جنبش بے اختیار چھلکا کے رکھ دے- خوبصورت تو گلی کی اور لڑکیاں بھی تھیں- حمیدہ- صبوحی- جوتھیکا- سدامنی- فہمیدہ- کلثوم اور پیچ در پیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمی رہتی تھی، اور گالوں پر سُرمے کے بنے ہوئے نقلی تِل------ وہ جوان بھی تھیں، لیکن انگیٹھی میں سلگتے ہوئے نمدیدہ کوئلوں کی طرح، جنہیں پھونکیں مار مار کر دہکایا بھی جائے تو لمحہ بھر کو بھڑک کر پھر اندر ہی اندر سلگنے لگتے ہیں- فریدہ تو ایک شعلہ تھی- محض آگ یا انگارہ نہیں------ ایک شعلہ، لپکتا ہوا، لہکتا ہوا، چچھاتا ہوا، جو اپنی تابانیوں کے لئے کسی سہارے کا منت کش نہیں ہوتا- بلکہ فاسفورس کی طرح اپنے آپ بھڑک اٹھتا ہے- بچپن میں کوئی اسے بے چین بوٹی کہتا تھا کوئی کہتا تھا چنگاری ہے بابا چنگاری- آخر بڑھتے بڑھتے یہ چنگاری انگارہ ہوئی، اور جوان ہو کر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی- گھر کی ساری کھڑکیاں بند رہتی تھیں- دروازوں پر موٹی موٹی چقیں پڑی رہتی تھیں- اور پاسبانی کے لئے فریدہ کی ماں، فریدہ کی خالہ، فریدہ کی آپا نیپالی دربانوں کی طرح چوکس رہتی تھیں- لیکن تنور ڈھانپنے سے اتنا ہی تپتا ہے- نانک شاہی اینٹوں کی ڈیڑھ فٹی دیواریں بھی فریدہ کو اپنی اوٹ میں چھپا کر رکھنے سے قاصر تھیں- ساز کے پاؤں میں تو بیڑیاں تھیں، لیکن سوز کا راستہ کون روکتا؟ گلی میں آنے جانے والے راہگیروں کو اچانک ایک غیر مرئی ایک ناقابل فہم سا احساس ہوتا تھا، کہ اس گھر میں کچھ ہے- رنگ برنگی چوڑیوں کی ایک کھنک، دبے دبے قہقہوں کی ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھنکار، رقصندہ قدموں کی ایک دھمک نانک شاہی اینٹوں کی پختہ دیواروں، ٹاٹ کے موٹے موٹے پردوں اور شیشم کے سنگلاخ دروازوں کا سینہ چیرتی ہوئی راہگیروں کے دامن پر برق سوزاں کی طرح جا گرتی تھی۔ ان کی کن پٹیوں میں خون کا دباؤ تیز ہو جاتا تھا، اور وہ دل کے پردوں میں کسی میٹھے احساس کا سرمایہ چھپائے تیز تیز گزر جاتے تھے۔ سامنے بالکنی میں گورے گالوں والی سدا منی اشاروں کی زبان سے پکار پکار کر دعوتِ نظارہ دیا کرتی تھی۔ فہمیدہ جان بوجھ کر کھڑکی کی سلاخوں میں منہ ڈال کر اپنی لانبی گردن لٹکائے رہتی تھی۔ صبوحی دروازے کی اوٹ سے گلی کی طرف تاکتی رہتی تھی۔ جو تمیکا ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد برآمدے میں بال بنانے آکھڑی ہوتی تھی۔ گزرنے والے انہیں دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ گھورنے والے انہیں گھور کر نکل جاتے تھے اور للچائی ہوئی نظروں کا یہ تصادم لمحہ بھر کے لئے دونوں طرف کی پیاسی جوانیوں پر ہلکی سی پھوار کر جاتا تھا۔ لیکن جو انوکھا احساس گزرنے والوں کو فریدہ کے گھر میں چھپی ہوئی ایک ان دیکھی، ان سنی، ان جانی کشش سے ہوتا تھا، وہ نہ سدا منی کے گورے گالوں میں تھا، نہ جو تمیکا کی سریلی آنکھوں میں، نہ فہمیدہ کی لچکیلی گردن میں!

"ہائے ہائے ڈائن، آگ لگے تیری صورت کو۔" فریدہ کی ماں ڈانٹا کرتی تھی۔ "جب دیکھو آئینے کے سامنے دیدے مٹکاتی رہتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں تیرا خصم بیٹھا ہے شیشے کے اندر؟"

"نہ بابانہ۔" خالہ بی لقمہ دیتی تھی۔ "جوان جہان بیٹیوں کو مٹ کر ہی جینا چاہئے۔ فریدہ دوپٹہ تو سنبھال نامراد۔ یہ قمیض کے بٹن کہاں بھاگ رہے ہیں؟ چل سنبھل کے بیٹھ-----کیا توپ خانہ نکالے پھرتی ہے بے حیا۔"

فریدہ کی بڑی آپا ہاتھ نچا نچا کر طعنہ دیا کرتی تھی۔ "بی بی دو دن اور صبر سے کاٹ لو۔ پھر خصم ہی خصم ہے جیون میں۔ چار دن میں گرمی نہ نکل گئی تو کیا۔ صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بیٹھ جائے گا ہاں-----" اور یہ کہتے

ہوئے بڑی آپا کو شاید اپنا بیمار خصم یاد آتا تھا جو ایک مریل سا بچہ اس کی جھولی میں ڈال کر سال بھر سے ہسپتال میں پڑا تھا۔

فریدہ سوچتی تھی، کہ خدا جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو خواہ مخواہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ کیا وہ کسی سے اپنا خصم مانگتی تھی؟ کیا اس نے آج تک کسی کو اپنا خصم بنایا تھا؟ جو تمیکا تو چوری چھپے ایک بچہ بھی پال رہی تھی۔ صبوحی کا ایک تانگے والے سے یارانہ تھا۔ جو اسے سکول پہنچانے جایا کرتا تھا۔ اور بیچ در بیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ دودھ بیچنے والے چھوکرے کو باورچی خانے میں لے جاتی تھی جہاں دودھ لیتے لیتے اس کی زلفوں کے خم اور بھی ٹیڑھے ہو جاتے تھے اور اس کے گالوں پر سُرمے کے بنے ہوئے نقلی تل مدھم پڑ جاتے تھے! فریدہ تو دن بھر گھر کے کام کاج میں جُتی رہتی تھی۔ وہ کمروں اور صحن میں جھاڑو دیتی تھی۔ کھانے پکانے کا سامان کرتی تھی۔ میلے کچیلے کپڑوں کو دھوتی تھی۔ اور محتانے میں اسے اگر کچھ ملتا تھا تو اماں کی گھرکیاں خالہ بی کی ڈانٹ، بڑی آپا کے طعنے----- وہ تو چاہتی تھی کہ گھر بار کا کام سمیٹ کر جب اس کا انگ انگ ٹوٹنے لگے، اور وہ تھک ہار کر اپنی پلنگڑی پر کھٹ سے گر جائے، تو گداز گداز بانہوں کی آغوش اسے اپنی گرفت میں دبوچ لے، اور پیار بھری میٹھی میٹھی تھپکیاں اس کے جسم میں چٹخنے والے انگاروں کو سکون کی نیند سلا دیں----- لیکن اس سہانے خواب کی تعبیر آخر یہ نکلی کہ ایک دن صحن میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ دالان میں براتیوں کا ہجوم ہو گیا۔ پچھواڑے میں نائی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں پکانے لگے اور شفقِ شام کے کھلتے کھلتے ماں، خالہ بی، اور بڑی آپا نے اپنی ناک کے صدقے ایک بھرپور جوانی کا جنازہ گھر سے نکال دیا۔ اور فریدہ بیگم عمر بھر کے لئے کلیم اللہ خان لولابی کے پلے باندھ دی گئی۔

کلیم اللہ خان لولابی کئی لحاظ سے خوش مزاج اور نیک چلن خاوند تھا۔ لیکن کائی کی طرح جو ٹھنڈے پانی کے سکون پر سوئی پڑی ہو! اس کے دماغ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رس بی۔ اے کی ڈگری نے چوس لیا تھا۔ اس کے جسم کا رس پے در پے بے روزگاری گھول کر پی گئی تھی۔ اور اس کی جوانی کا رس اب ضلع کچہری کی کلرکی نچوڑ رہی تھی۔ جسم اور روح کی اس قربانی کے صدقے اسے ہر مہینے پینتالیس روپے نقد تنخواہ کے مل جاتے تھے۔ ساڑھے پندرہ روپیہ مکان کا کرایہ۔ تین روپے کے جہاز مارکہ سگریٹ------ ڈھائی روپیہ پان تمباکو------ بیس روپے ہوٹل کھانے کے------ اور باقی چند ٹکوں میں وہ کپڑے بھی خریدتا تھا، جوتے بھی کتابیں بھی، اخبار بھی، اور کبھی کبھی سستی شراب کا اڈھا یا کسی سستی سی عورت کا اونگھتا ہوا رستا ہوا، کسمساتا ہوا، ڈھیلا ڈھالا جسم------ لیکن فریدہ کے آتے ہی اس کے بہت سے بل نکل گئے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی زندگی کا کُہراب ہولے ہولے چھٹ رہا ہو۔ جیسے پالے کے مارے ہوئے، ٹھٹھرتے ہوئے بدن پر گرم گرم نرم نرم ریشمیں لحاف تان دیا جائے------

کلرکی نے کلیم کو زندگی کے بہت سے ٹوٹکوں سے روشناس کردیا تھا وہ جانتا تھا کہ تھکے ہوئے حاکم کے سامنے لمبے چوڑے پیچیدہ کاغذات لے جانے سے خاطر خواہ حکم لکھوایا جا سکتا ہے۔ دو چار سکوں کی روپہلی جھنکار ایک اونگھتی ہوئی، رستی ہوئی، کسمساتی ہوئی عورت کے جسم کو برقانے رکھ دیتی ہے۔ سستی وسکی کا ایک آدھ جام دماغ کی پریشانیوں پر سکون کا پھاہا رکھ دیتا ہے------ لیکن جب جوالا مکھی کی طرح بھڑکتی ہوئی فریدہ اس کی جھولی میں ڈال دی گئی، تو اس کا دامن جل اٹھا۔ اگر فریدہ مسکراتی تھی، تو وہ اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کے درمیان زور سے چوم لیتا تھا۔ اگر وہ گاتی تھی، تو وہ اس کے گلے کا نور نوکِ زبان سے چاٹ جاتا تھا------ لیکن کچھ ایسی بات تھی کہ فریدہ کے سامنے وہ ہمیشہ بے بس اور مجبور ہو جاتا تھا------ پکے ہوئے آم کی طرح جس پر ذرا سا بوجھ پڑنے سے گٹھلی تو پچ سے دور جا گرتی تھی۔ اور فریدہ کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا تو چھلکا، لجلجا پلپلا چھلکا، جسے چوسا بھی

جائے تو کسیلے گھونٹوں کے سوا اور کچھ پلے نہ پڑے۔

فریدہ سپنوں کی ایک دنیا سے نکل کر آئی تھی، اور اب وہ سپنوں کی دوسری دنیا میں جا بسی۔ خوابوں کے ان دو جزیروں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ماں کے گھر میں جب وہ کام کاج سے تھک کر اپنے پلنگ پر لیٹتی تھی، تو ان جانی آرزوں، ان کہی اُمیدوں کے تصورات نیا نیا روپ بھر کر اس کی نیند میں گاتے اور ناچتے تھے۔ دن رات خصم خصم کے طعنے سن کر بھی وہ خواب میں چاندنی کی طرح غیر مرئی اور احساس کی طرح موہوم سایوں کے ساتھ کھیلتی تھی------ نئی نویلی دلہن کی طرح جو گھونگھٹ کا پٹ کھولتے ہوئے اس لئے جھجکتی ہو کہ شاید اس کے سامنے زمین نہ ہو، تاروں بھرا آسمان ہی آسمان ہو------ اور ایک روز فریدہ سچ مچ کی دلہن بھی بنی۔ کہاروں کی ڈولی نے اسے ایک پلنگ سے اٹھا کر دوسرے پلنگ پر لا ڈالا۔ پہلا پلنگ سادہ تھا۔ دوسرے کے پائے رنگین تھے۔ لیکن ان پلنگوں کے درمیان زندگی کا ایک عزیز سرمایہ لٹ کے رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو سو براتیوں نے اللہ اور رسول کو بیچ میں رکھ کے اُسے چکمہ دیا تھا اور بجھی ہوئی راکھ کا ٹھنڈا بورا، اس کے پلے باندھ کر چلتے بنے۔ اب بڑی آپا کے ہاتھ نچا نچا کر دیئے ہوئے طعنے فریدہ پر منکشف ہونے لگے اور جیون میں خصم ہی خصم کا جو راگ وہ سنا کرتی تھی وہ کلیم اللہ خان لولابی کی عملی شکل میں اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ سپنوں کی دنیا میں جو رنگ محل اس نے کھڑے کئے تھے، وہ ایک ایک کر کے مسمار ہونے لگے۔ اب اس کے خوابوں میں قوسِ قزح کے رنگوں کی جگہ اجڑے ہوئے سائے آنے لگے۔ مسرور جھولوں کی جگہ ہچکولے آنے لگے ادھوری خواہشوں کے ہچکولے۔ تشنہ آرزوؤں کے ناکام آسروں کے ہچکولے------

اور پھر ایک دن اس کے خواب میں ڈاگی آیا۔ ڈاگی اس کا چہیتا پلا تھا۔ وہ اپنی سنہری بالوں والی دم ہلاتا ہوا لپکا۔ اس نے اپنے اگلے پاؤں فریدہ کی گردن سے لٹکا دیئے۔ ڈاگی خر خر کرتا ہوا جھکا۔ اس کی نرم نرم گرم گرم زبان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فریدہ کی ٹھوڑی اور گردن کو زور زور سے چاٹنے لگی۔ ڈاگی کے وحشی پنجے فریدہ کے تن بدن مین پیوست ہو گئے------ ایک بھونچال سا آیا۔ جیسے بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھک سے پھٹ گئے ہوں۔ فریدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے لالٹین کی بتی کو اونچا کیا۔ ساتھ والے پلنگ پر کلیم سویا ہوا تھا۔ ہر خراٹے کے ساتھ اس کے پیلے پیلے گال پھول جاتے تھے، جیسے کوئی شریر بچہ آم کے چُسے ہوئے چھلکے میں ہوا بھر رہا ہو! کمرے کے ایک کونے میں ڈاگی تھا وہ ایک کھردرے سے ٹاٹ پر سانپ کی طرح کنڈلی مارے اونگھ رہا تھا فریدہ نے چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا پھر اس نے دبی زبان سے چُس چُس کر کے ڈاگی کو پکارا۔ ڈاگی نے آنکھیں کھول کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ فریدہ نے ہاتھ پھیلا کر پھر پکارا ڈاگی دم ہلاتا ہوا اٹھا زبان نکال کے لپکا اور فریدہ نے اسے اپنی بانہوں کے درمیان دبوچ لیا!

تین تارے

رانو، نصرت، جوز------ رانو کا پورا نام رنیکا تھا۔ جوز کا جوزفین نصرت کا نصرت، اگرچہ اس کا نام تو شگفت ہونا چاہیئے تھا!

صدر بازار میں چوک کے پاس ایک خوانچے والا بیٹھتا ہے۔ وہ لہک لہک کر اپنے گاہکوں کو دعوت دیا کرتا ہے------ تراوٹ میں آیئے! تراوٹ میں آیئے!!" وہ چار آنے میں تین سنگترے دیتا ہے پاس ہی دوسرے دکاندار چھ پیسے میں دو دو کی پکار لگاتے ہیں۔ لیکن وہ محض سنگترے بیچتے ہیں خوانچے والا طراوت بھی ساتھ دیتا ہے! میں پوچھتا ہوں نام میں کیا نہیں ہے۔

اگر اس کا نام فقط مس شاکرداس ہوتا تو لوگ آتے بیٹھتے، ہنستے، کھیلتے اور چلے جاتے اگر اس کا نام صرف جوزفین ہوتا تو آتے، بیٹھنے، ہنسنے کھیلنے کے عمل میں شاید بالشت ڈیڑھ بالشت کا اضافہ ہو جاتا۔ لیکن جب کسی نے تعارف یوں کروایا، کہ یہ مس شاکرداس ہیں، مس جوزفین شاکرداس" تو لمحہ بھر کے لئے یہ محسوس ہوا گویا رڈ یارڈ کپلنگ اور مرزا غالب گلے مل کر زاروقطار رو رہے ہیں۔

"جی ہاں، جوزفین۔" اس نے اپنی پلکوں پر حیا کا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن گھر میں مجھے سب جوز کہتے ہیں۔"

بال روم کا آرکسٹرا ایک نشیلی دھن بجا رہا تھا۔ نشیلے جوڑے مستانہ وار ناچ رہے تھے۔ میں نے جوز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا کہ اس نام میں ترنم،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

، تاریخ کے رومان بھی ہیں۔ کیونکہ جس عورت کو ملکہ بنانے کے لئے ایک سپاہی نے شہنشاہ بننا قبول کیا۔ اس کا نام بھی جوزفین ہی تھا۔

وہ لجاسی گئی۔ "آپ باتیں خوب بناتے ہیں------ میرا خیال ہے آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔"

"جی ہاں، بلکہ عشق ہے۔"

"اوہو، آپ عشق بھی کرتے ہیں!" اس نے شرارت سے ناچتے ہوئے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ "میں نے بھی ایم۔ اے میں ہسٹری کا مضمون لیا تھا۔ مجھے خود اس سے دلچسپی ہے۔"

"عشق نہیں؟"میں نے ناچ ہی ناچ میں اپنا پاؤں ہلکے سے اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"ہاں، آج شاید اب ہو جائے!" وہ آرکسٹرا کی مدہوش دھن کی طرح میرے قریب تر آگئی۔ "آپ کو تاریخ کا کونسا کیریکٹر سب سے زیادہ پسند ہے؟

"نورجہاں۔ "میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔ اور آپ کو؟"

"جہانگیر!"

اپنی میز کے پاس پہنچ کر ہم نے شمپین کے دو جام منگوائے۔

"ملکہ نورجہاں کے لئے!"میں نے اپنا جام اٹھا کر جوش سے کہا۔

"شہنشاہ جہانگیر کے لئے!"اس نے اپنا جام اٹھا کر میرے جام سے لگا دیا۔

برفائی ہوئی شمپین کے ارغوانی گھونٹ اس کے گلے میں ہلکی ہلکی پھریریاں پیدا کرتے ہوئے ڈھل رہے تھے۔ جیسے مرمر کی صراحی میں آبِ حیات ٹپکایا جا رہا ہو! اس لمحے مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مغل بادشاہوں نے اپنی یادگاروں میں صرف مقبرے ہی نہیں چھوڑے، کچھ زندہ رومان بھی چھوڑے ہیں۔

جب ہم دوبارہ ناچنے کے لئے اُٹھے، تو ہمارے درمیان سے اجنبیت کا

پردہ اور بھی اٹھ گیا تھا۔ جہانگیر اور نور جہاں کی کہانی ہمیں روحانی طور پر ایک دوسرے کے قریب لے گئی تھی۔ شمپین کے ٹھنڈے گھونٹ ہمیں جسمانی طور پر قریب تر کرنے لگے۔ روح اور جسم کے ربط کی یہ سریلی تان آرکسٹرا کی دھن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "جوز! زندگی کے یہ عزیز لمحے کس قدر خوشگوار ہیں۔ اور کتنے مختصر!۔"

"جی ہاں۔ زندگی بھی تو مختصر ہے------ لیکن جینے والے سو سو برس بھی جیتے ہیں!"

جوز کی آنکھوں میں ایک تیکھی طنز تھی۔ پلکوں ہی پلکوں سے گویا اس نے میری لرزتی ہوئی ہمت پر تازیانہ لگا دیا، کہ جینے والے اس طرح خوشگوار اور مختصر لمحوں کو ضائع نہیں کرتے۔ تم ان دلربا گھڑیوں کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنا سکتے ہو۔ لیکن تم میں ہمت بھی ہو!

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا! کہکشاں کی چادر میں لپٹے ہوئے تاروں کو بھی نوچ سکتا ہے------ یہ دوسری بات ہے کہ شاید وہ پھوٹے ہوئے کنکر ہی نکلیں!

رانو کی بات دوسری تھی۔

اس کی آنکھوں میں کچھ عجب رس تھا۔ ایک اتھاہ گہرائی۔ جیسے کنول کے کٹوروں میں شراب چھلک رہی ہو۔ ایک روز ریڈ کراس فنڈ کے لئے کھیل ہو رہے تھے۔ گھوڑ دوڑ ہوئی۔ سائیکل رِکشاؤں کا مقابلہ ہوا۔ فینسی فٹ بال کھیلا گیا۔ اور آخر میں میوزک کانفرنس منعقد ہوئی۔ سب سے اچھا گانا کملا ڈھینگرا کا تھا۔ اس نے اپنے گلے کا سارا نور مالکوس کی راگنی میں بھر دیا۔

رانو اگلی صف میں بیٹھی تھی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ کملا گا رہی تھی۔ اس کی سُریلی تانیں رس اور مٹھاس کی چاشنی بن کر ہلکی ہلکی پھوار کی طرح منتشر ہو رہی تھیں۔ سُر اور تان کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کنول کے کٹوروں میں پھریریاں اٹھتی تھیں، اور کملا کے گیت رانو کی آنکھوں میں لہریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بن بن کر رقص کر رہے تھے------

رانو کی آنکھوں میں ایک جھنکار سی آ گئی- اور وہ کملا کے گانے کے ساتھ ساز کی طرح آویزاں ہو گئیں- جب کملا کو انعام کا تمغہ ملا تو میں نے ہولے سے زیرلب کہا- کہ اس کی اصلی حقدار تو رانو ہے!

"جی؟" وہ چونکی- "لیکن میں نے گانا تو نہیں گایا-"

"موسیقی صرف آواز ہی میں نہیں ہوتی!" میں نے اس کی رقصندہ آنکھوں کی طرف اشارا سا کیا- وہ شرما گئی- رانو کی آنکھوں کی پلکوں میں میرے لئے ایک دنیا سی آباد ہو گئی تھی- زمین اور آسمان کی ہر چیز پر کنول کے پھول کھلے ہوئے نظر آتے تھے- لیکن اس نئی دنیا کے وجود پر ہمیشہ ایک کہرا سا چھایا رہا- ایک خاموش غبار سا، جیسے کسی رنگ محل کے اُونچے اُونچے کلس بادلوں کے اوٹ میں چھپے ہوئے ہوں- کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے کبھی رانو سے یہ نہ کہا کہ اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں- میں نے کبھی اس کو یہ نہ بتایا کہ اسکی گھنی پلکوں کے سائے میں ایک ننھی سی دنیا تعمیر ہو رہی تھی- اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ ہم دونوں سمندر کی لہروں کی طرح ایک ہی ساحل کی طرف جا رہے تھے- وہ مجھے ایک بار بھی نہ بتا سکی کہ ہمارے دل کی دھڑکنوں نے چوری چوری ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا لیا تھا------ ہم وقت کے پردے میں خاموش دھماکے سنتے رہے- دو برس تک ہم ایک دنیا میں رہے لیکن متوازی خطوط کی طرح الگ الگ------ ایک ہی کشتی میں سوار، لیکن دریا کے کناروں کی طرح جدا جدا- ہر روز ہم ملتے تھے- کبھی کلب میں- کبھی سنیما میں- کبھی گھر میں- کبھی یہاں- کبھی وہاں------ اور گھنٹوں ہم کھیلتے تھے- کبھی پنگ پانگ- کبھی ٹینس- کبھی تاش- کبھی کیرم------ ایک روز ٹینس کھیلتے کھیلتے اس کے پاؤں میں موچ آ گئی- مجھ سے یہ بھی نہ ہوا کہ اسے سہارا دے کر کرسی تک لے جاؤں- کلب کے دو بیروں نے اسے اٹھا کر کوچ پر لٹا دیا اور پھر ایک روز تاش کھیلتے کھیلتے میز کے نیچے اچانک ہمارے پاؤں ایک

دوسرے کے ساتھ ٹکرا گئے- ہم نے اٹھ کر ایک دوسرے سے معافی مانگی- لیکن ہمارے دل یہی کہتے رہے کہ تم دونوں جھوٹے ہو- چور ہو- تم تو چاہتے تھے کہ وہ مختصر سا لمحہ غیرفانی ہو کر کائنات پر چھا جائے- اور اب تم معذرت کرتے ہو- جھوٹے مکار------ اور اس جھوٹ کی سزا انجام کار یہ ملی کہ رانو کا ایک جگہ بیاہ ہو گیا- ہونا ہی تھا- لیکن ہمارے درمیان آرزوؤں کی جو ایک خوشنما ٹیکسلا مسمار ہوئی تھی اسے ابھی تک کوئی کھود نہیں سکا- کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کہکشاں کی پھلواری میں ایسے تارے بھی تو ہیں، جو صرف نظر آتے ہیں، ہاتھ نہیں آتے- لیکن نصرت کا وجود رانو اور جوز دونوں سے الگ ہے- وہ اس تارے کی طرح ہے جس کی روشنی ابھی زمین تک نہیں پہنچی------ میرا مطلب ہے کہ میں نے آج تک نصرت کو نہیں دیکھا- لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام شکست ہونا چاہیئے تھا------ وہ جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے ایک لڑکی ہے- شاید وہ جوان ہو- شاید وہ خوبصورت ہو------ لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کون ہے اور کیسی ہے------ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ وہ ہے اور ابد تک رہے گی- اسے ابد تک رہنا ہی چاہیئے- مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اُسے ابد تک رہنا ہی چاہیئے مگر اس کے چاہے یا نہ چاہے سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو ابد تک رہنا ہی پڑے گا- وہ بنی نوع انسان کا عزیز سرمایہ ہے- وہ لٹ سکتی ہے- لٹا سکتی ہے- لیکن وہ مٹ نہیں سکتی- شاید وہ مٹا سکتی ہو، لیکن لالے کا داغ نہ آندھی نے مٹایا ہے نہ کالی گھٹاؤں نے- بیچاری نصرت کی کیا بساط ہے------ جب کہ اس کا نام ہی شکست ہو! کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ محض عورت ہے------ یعنی مرد کی ایک آدھ حاجت روا کرنے والی بے ذائقہ سی دوا------ جیسے قبض کے لئے کسٹرائل، یا کھانسی کے لئے جوشاندہ- کبھی خیال آتا ہے کہ شاید وہ عورت نہ ہو، محبوبہ ہو- ان دونوں بہنوں میں بڑا فرق ہے- ایک آرزوؤں کو پورا کر کے مٹا دیتی ہے- دوسری تمناؤں کے ان مٹ جزیرے آباد کیا کرتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ لیکن منزل تو دونوں کی ایک ہے۔ عورت یا تو خود تھک ہار کر پلنگ پر جاگرتی ہے، ورنہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گرالیا جاتا ہے۔ لیکن محبوبہ کی مسافت ناز کے سہارے طے ہوتی ہے۔ وہ تمناؤں کی کشتی میں سوار ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے ہچکولے اُسے جھولا جھلاتے ہیں۔ لیکن اس کے رومانوں کی پرواز بھی اپنی روایتی پلنگڑی کے پاس جا کے ختم ہو جاتی ہے------ میرا خیال ہے کہ نصرت عورت بھی نہیں، محبوبہ بھی نہیں، محض نصرت ہے۔ یعنی جس کا نام شکست ہونا چاہیئے تھا۔ میں تصور ہی تصور میں اپنے ویرانوں کو نصرت سے آباد کرلیتا ہوں۔ ایک معمولی سی، آوارہ سی غمدیدہ لڑکی۔ جسے اپنے پاس بٹھا کے یہی جی چاہے کہ صرف باتیں ہی کئے جاؤ۔ غم کی باتیں الم کی باتیں۔ شکست کی باتیں۔ فلسفہ نہ سہی۔ ادب نہ سہی------ نہ قہقہے ہوں۔ نہ راز ہو۔ نہ نیاز ہو------ فقط نصرت ہو۔ اور اس کی باتیں۔ جب اس نے پہلی بار محبت کی۔ جب اسکی محبت کے آبگینے پہلی بار چُور ہوئے۔ جب اس نے دوسری بار محبت کی۔ جب اس کی محبت کے آبگینے دوسری بار چُور ہوئے۔ جب اس نے تیسری بار------ لیکن میں بہک رہا ہوں میں باتوں ہی باتوں نصرت کے چھپائے ہوئے رازفاش کر رہا ہوں۔ شاید نصرت مجھے کبھی معاف نہ کرے گی------

لیکن نصرت تم جانتی ہو، میں بالکل بے ریا ہوں۔ مجھے نہ عورت کی تمنا ہے، نہ محبوبہ کی۔ میں تو نصرت کو چاہتا ہوں، خواہ وہ شکست ہی کیوں نہ ہو------ جو گوشت اور پوست کی خواہشوں سے بے نیاز ہو کر کسی کو اپنا سکے------ بہن کی طرح۔ ماں کی طرح ساتھی کی طرح------ لیکن عورت کی طرح نہیں۔ محبوبہ کی طرح نہیں------ بلکہ شکست کی طرح!

پہلی تنخواہ

تین سوننانوے روپے پندرہ آنے------ ایک آنہ رسید کے ٹکٹ کا کٹ گیا۔ ورنہ پورے چار سو ہوتے۔ رومیش نے نوٹوں کا پلندا سنبھال کر جیب میں ڈالا، اور خزانچی کے زمین دوز سلام کا جواب گردن کی ایک رعونت آمیز جنبش سے دے کر خزانے سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل میں رسید کا ایک آنہ کٹ جانے کا درد تھا۔ ورنہ اس کی جیب میں اب تین سوننانوے روپے پندرہ آنے کی جگہ پورے چار سو روپے ہوتے۔ کل چار سو روپے، اور دنیا بھر کا خرچ۔ اُف! یہ سرکار بھی کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتی ہے۔ میرے دستخطوں پر ایک پورے دفتر کا کام چلتا ہے۔ لیکن جب تنخواہ کے چار سو روپوں کی بات ہو تو ایک آنہ رسید کا ضرور کٹے گا------ چہ، رومیش نے غصّے سے خزانے کے چپراسی کی طرف دیکھا۔ جو پھاٹک کے پاس کھڑا اسے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا۔ جیسے بخشیش کی ایک چونی پر اس کا پیدائشی حق ہے۔ لوگوں نے بھی کیا کیا واہیات رواج بنا رکھے ہیں۔ بیکار۔ فضول۔ جیسے وہ اُلّو کا پٹھا کوئی تنخواہ ہی نہیں پاتا۔ یہی بخشیش تو رشوت کا پہلا سبق ہے------ بچ گیا شیطان۔ اگر مُنہ سے کچھ مانگتا، تو رپورٹ ہو جاتی سالے کی------

راستہ بھر رومیش مسکراتا رہا۔ ہنستے کھیلتے چہرے، بھڑکیلی دکانیں، چمکیلے لباس------ زندگی میں مسرت کی چاندنی، خوشی کی لہریں------ واہ! کیا کہنا------ جب وہ اپنے نئے فرنشڈ گول کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے ایک بےچین سا احساس ہولے ہولے ستانے لگا۔ اس نے سوچا کہ آج اس کی کوٹھی کچھ خالی خالی سی نظر آتی ہے۔ کمروں کا فرنیچر خوشنما تھا احمری پردے نفاست سے لٹکے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں پھول تھے۔ الماریوں میں کتابیں۔ میز پر نئے رسالے۔ آتشدان کے بائیں کونے میں ٹیگور کا مرمریں مجسمّہ۔ دائیں کونے میں تانبے کا ننھا سا دمکتا ہوا کیوپڈ------ لیکن ان پر ویرانی سی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی ضروری چیز کھو گئی ہو۔ جیسے ایک بے پایاں، بے کنار خلا نے سارے گھر کو نگل لیا ہو------ رومیش ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے پر جا بیٹھا۔ وہاں سے کرسی پر آگیا۔ پھر میز پر۔ پھر آتشدان کے پاس۔ ابھی یہاں۔ ابھی وہاں۔ وہ بے چین تھا۔ وہ تلملا رہا تھا۔ اُسے غصہ آنے لگا۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ خالی ڈھول کی طرح۔ ڈھم، ڈھم، ڈھم، ڈھم، تھپ، تھپ، تھپ، ------ نہ اس کے ساتھ شہنائی کی گت۔ نہ ستار کا الاپ۔ یہ خالی خولی کمرا۔ یہ ویران صوفے۔ یہ اجڑی ہوئی فضا------ کیوں نہیں کوئی اس کے ساتھ والی کرسی پر آبیٹھتا؟ جس کی مسکراہٹوں کے پھول ان گلدستوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں۔ جس کے نقرئی قہقہے کمرے کی بے معنی خاموشی میں چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں------ جوندی کی نہروں کی طرح مچل مچل کر بھاگے۔ رومیش جیب سے نوٹوں کے پلندے نکال نکال کر اس کے منہ پر مارتا جائے------ سارے کمرے میں نوٹ ہی نوٹ بکھرے ہوئے ہوں------

"حضور، اس خط پر ٹکٹ کم ہے۔ ڈاکیہ ایک آنہ مانگتا ہے۔" رومیش کے نوکر نے ایک بوجھل سا لفافہ لا کر دیا رومیش نے دستخط پہچان کر خط کو ہاتھ میں تولا۔ اس کے کندھے بیزار کن تھکاوٹ سے سکڑ گئے۔ اونہہ، پنشن پانے کے بعد پتاجی تو بالکل بیکار ہو گئے۔ لیکن انہیں اتنا بھی خیال نہ آیا، کہ بچارا بیٹا نیا نیا ملازم ہوا ہے۔ اسے اتنے لمبے چوڑے خط پڑھنے کی فرصت کہاں؟ ان کی بلا سے------

رومیش نے سگار سلگا کر لفافہ کھولا اس میں بہت سے خط تھے۔ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے۔ چہ خوش! رومیش نے لمبے لمبے کش لگائے۔ اب تو گھر کا گھر خط لکھنے کا شوقین ہو گیا ہے!

پہلا خط رومیش کے پتا کا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہی پرانی، باسی باتیں۔ "صحت کا خیال رکھنا۔ دوسرے تیسرے روز کونین کی ایک گولی کھا لیا کرو------ شام کے وقت لمبی سیر کرنا چاہیئے------ سورج نکلنے سے پہلے تھوڑی سی ورزش ضروری ہے------" جیسے یہ باتیں کوئی اور جانتا ہی نہیں!

دوسرا خط ماتاجی کا لکھا ہوا تھا۔ "پرماتما نے بڑی مرادوں کے بعد یہ دن دکھایا ہے۔ بیٹا، کل تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی۔ ایشور تمہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ پہلا کام یہ کرنا کہ شوجی کے مندر میں پھول چڑھا کے تین براہمنوں کو بھوجن کھلانا------ محلے کے یتیم بچوں کو کپڑے بنوا دینا------ دان پن میں بڑا آنند ہوتا ہے، بیٹا------ میں بھی اگلے مہینے ضرور اپنے بیٹے کے پاس آؤں گی------ پرماتما کا کتنا شکر ہے------" ماتا بھی کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہے! مندر میں چڑھاوا! برہمنوں کو بھوجن یتیموں کو خیرات------ چھی! ماتا کو کیا معلوم کہ ابھی اگلے روز رومیش نے انسداد گداگری کے جلسے میں کرسی صدارت کو زینت بخشی تھی------ اُف دنیا بھر کے بکھیڑے اور ایک آنہ کم چار سو روپے نقد۔ وہ خیر ہوئی کہ خزانے کا چپراسی کچھ ہچکچا گیا، ورنہ ایک چونی اور نکل جاتی۔ اور پھر ماتا جی ہیں، کہ خود بھی یہاں آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ خواہ مخواہ۔ جیسے پتاجی کے پاس انہیں بے حد تکلیف ہے! بڑھاپے میں سفر کرنا بھی تو ایک زحمت ہے۔ ایک کمرے کا فرنیچر درہم برہم کر کے ان کی پوجا کا انتظام ہو گا۔ وہ کیک، گوشت، انڈوں پر کس قدر ناک بھوں چڑھائیں گی۔ اور پھر ان کی سیاہ کنارے والی سفید دھوتی------ میں کہتا ہوں، اس روشنی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی پرانی اور دقیانوسی باتیں------

تیسرا خط شانتا کی طرف سے تھا "------ بھیّا ہماری چیزیں نہ بھول

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانا- بمپروں کے نمونے بھیج دیئے تھے- جارجٹ کا رنگ بسنتی کی جگہ گلابی ہو تو اچھا ہے- یوں تو آسمانی رنگ بھی برا نہیں- اگر ہو سکے تو دونوں بھیج دیں- شلواروں کی سلک احتیاط سے خریدیں- سفید ہو تو سب سے بہتر، ورنہ ہلکا شربتی رنگ اچھا رہے گا- آپ نے تو کہا تھا کہ جاتے ہی یاڈلے کا رُوج اور لپ سٹک بھیجدوں گا- میرے پاس تو اب پاوڈر تک نہیں رہا- یہاں پر کسی دکان میں ویسرین نہیں ملتی- پتا جی بازار سے کچھ ہینڈ بیگ دکھانے کے لئے لائے تھے- مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا- جیسے بھینس کے چمڑے کے بنے ہوئے ہوں! آپ کو کراکوڈائل لیدر کا ہلکا سا ریتی ٹی بیگ مل سکے، تو خرید رکھیں------ آج کل میری ایک سہیلی یہاں آئی ہوئی ہے- آپ کو شاید چمپا یاد ہو گی- کانپور کے رائے صاحب گلاب مل کی بیٹی جس کے ساتھ ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے اس نے اس سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا ہے-

------ اگر آپ اس کے لئے کوئی اچھی سی چیز بھیج دیں، تو وہ بہت خوش ہو گی-"

شانتا اور اس کی فرمائشیں! رومیش نے سوچا، وہ روز بروز کتنی آزاد ہوتی جا رہی ہے- جب دیکھو بناؤ سنگار کا بھوت سر پر سوار ہے- جمپر، جارجٹ، رُوج، لپ سٹک------ کم بخت ماتا جی کی مثال سے بھی سبق نہیں لیتی- وہ اپنی سادگی میں کس قدر خوش ہیں- ان کی زندگی کیا بے فکری سے گزرتی ہے ------ خوب! چمپا نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! اب تو بڑی ہو گئی ہو گی------ اور یہ شانتا ابھی تک انٹرنس میں لٹکی ہوئی ہے------ کس قدر شوخ ہوا کرتی تھی چمپا! اب اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! چمپا! نام کچھ کچھ چنبیلی کے وزن پر ہے------ جیسے کلیاں! مسکراتی ہوئی کلیاں! میں اسے ضرور ایک تحفہ بھیجوں گا------ چمکتا ہوا سنگاردان؟ کالے اور پیلے اور نیلے بلاوز؟ مرمر کا کیوپڈ؟------

رومیش نے چوتھا کاغذ نکالا، تو اسے دستخط پہچاننے میں دقت ہوئی-

ننھی بملا نے اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا تھا- عبارت میں بچپن کی معصومیت بھی تھی، اور ایک چھوٹی بہن کا تحکمانہ انداز بھی- بملا کی فرمائشیں بہت بڑی نہ تھیں وہ پہلی تنخواہ کی اہمیت کو نہ سمجھتی تھی- اس لئے مندر کا چڑھاوا، یتیموں کی مدد، براہمنوں کا بھوجن اس کے لئے کچھ معنی نہ رکھتے تھے- زندگی کے پہلے آٹھ سالوں نے ابھی اسے جمپر جارجٹ اور رُوج کی کشش سے بھی آگاہ نہ کیا تھا- اسے انگریزی کا نیا قاعدہ چاہیے- ایک اچھا سا جزدان- سیاہ رنگ کے چمکدار بُوٹ- کچھ مٹھائیاں------ اور یہاں تک آ کر اس کی ضروریات کا تخیل پورا ہو جاتا تھا-

رومیش پر ایک وجدانی سرور سا چھا گیا- اس کے دل میں پیار کی ہلکی ہلکی گدگدیاں ہونے لگیں------ بملا نے کس محنت سے یہ خط لکھا ہو گا- لکھتے وقت وہ زبان ہونٹوں میں دبا کر کاغذ پر جھکتی ہوئی- اور پھر اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے قلم کو یوں خوبصورتی سے گھماتی ہو گی، جیسے ایک باکمال مصور اپنا رنگین شاہکار بنا رہا ہو!

انگریزی کا قاعدہ، اچھا سا جزدان، سیاہ رنگ کے چمکدار بُوٹ، کچھ مٹھائیاں------ رومیش دل ہی دل میں ان ننھی ننھی فرمائشوں پر مسکرا رہا تھا- دنیا میں ہر کسی کا تخیل اپنی ذات کے گرد منڈلاتا ہے! ماتا جی یہاں آنے کا ارادہ کر رہی ہیں- لیکن کیا اچھا ہو، اگر ان کی جگہ چمپا------ یعنی شانتا اور چمپا دونوں آجائیں! اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا- تین سو ننانوے روپے پندرہ آنے------ مہینہ بھر کا خرچ------ ننھی بملا کی فرمائشیں بھی کتنی ننھی ہیں------ لیکن بچوں کی تربیت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہیں ہوش سنبھالتے ہی دوسروں سے مانگنا سکھایا جاتا ہے------

رومیش نے ایک بار پھر اپنے ویران کمرے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی- اور وہ خلا جو آج یکایک وہاں پیدا ہو گیا تھا، اُسے اور بھی بے تاب کرنے لگا- سامنے پٹیل صاحب کی کوٹھی تھی- باغیچے میں رنگا رنگ کے پھول لہلہا رہے تھے ننھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کملا مالی کی قینچی ہاتھ میں لئے پودوں کو قطع وبرید کر رہی تھی۔ رومیش کو کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرائی، اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے سلام کیا۔

------ رومیش کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب کی طرف اٹھا، اور نوٹوں کے پلندے کے پاس جا کر رک گیا------ اوہ! اس نے سوچا، کملا کس قدر بڑھ گئی ہے! ابھی کل تو بچہ نظر آتی تھی------ اے کاش! آج پھر وہ میرے پاس سنگترے کے بیج مانگنے آئے------

رومیش کا جی چاہتا تھا، کہ وہ اپنے ویران ماحول سے فرار ہو کر اور کہیں نہیں تو کچہری کے کمرے میں چلا جائے۔ اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدموں، مسلوں اور فیصلوں میں کھو جائے------ شاید آج وہاں پھر وہ بڑھیا آئے جس کا بیٹا چوری کے الزام میں حوالات میں بند تھا۔ شاید اس کے ساتھ اس کی بہو بھی ہو------ وہ نوجوان، شرمائی ہوئی غم دیدہ لڑکی جو اس روز تن تنہا رومیش کی کوٹھی پر اپنے پتی کو چھڑانے آئی تھی۔ جب وہ زبان سے رحم کی زکواۃ نہ پا سکی، تو غالباً رشوت کے طور پر اس نے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا! ایک برق نُما چہرہ اس کے دامن پر تڑپ کے گرا۔ وہ دم بھر کے لئے دو تیرتی ہوئی سیلاب زدہ آنکھوں میں ڈوب گیا------ آہ، بیوقوف رومیش! آج سے چند روز پہلے وہ ایک جذباتی گدھا تھا۔ انصاف! اصول! سچائی! اخلاق! ------ اونہہ دنیا نے بھی کیا کیا ڈھونگ بنا رکھے ہیں۔ اس روز وہ خوبصورت لڑکی مایوس ہو کر لوٹ گئی۔ اے کاش، ایک بار پھر وہ اپنا پتی جیل سے چھڑانے آئے۔ صرف ایک بار------

رومیش نے بے تاب ہو کر کھڑکی بند کر دی۔ اور کمرے کی بے کیف خاموشی سے گھبرا کر باغیچے میں آگیا۔ سامنے مالن مرغیوں کو دانے بکھیر رہی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور وہ اپنے موٹے موٹے، بھدے سے ہونٹ پھلا کر مرغیوں سے کچھ مہمل سی باتیں کر رہی

تھی۔ رومیش ذرا زور سے کھانسا اور نوٹوں کا پلندا جیب سے نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا------ مالن نے نظر اُٹھا کر غور سے دیکھا، جھک کر سلام کیا، اور مرغیوں کو اپنے آگے لگا کر دوسری طرف چلی گئی------ غُوں------ غُوں------ غاں------ مالن مرغیوں سے اسی طرح پیار کرتی جا رہی تھی۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہُوا------ کوئی بھی نہیں------ رومیش نے سوچا، اس مطلب پرست دنیا میں کوئی بھی کسی کی پروا نہیں کرتا------ اور پھر سارا زور لگا کر اس نے نوکر کو پکارا۔

"چندو، وہائٹ ہارس کی ایک بوتل------ انگریزی شراب کی دکان سے ------ فوراً------"

چندو اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔ فرط حیرت سے اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

"تم جاتے کیوں نہیں؟" رومیش کڑک کر بولا۔ "میری طرف گھور کیا رہے ہو------ حرامزادے------"

صبح صادق کے جھٹپٹے میں چندو نے سنگار میز پر حجامت کا سامان لگا کے رکھ دیا۔ رومیش ایک صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی پر وہائٹ ہارس کی خالی بوتل تھی۔ احمری پردوں سے چھن چھن کر آنے والی چند مدھم سی شعاعیں کمرے میں تھرتھرا رہی تھیں۔ ننھی، بلا کا خط صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔ اور اس کے قریب رومیش کی پہلی تنخواہ------

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صنم پلکیت

چے چے کی بستی رات کے سکوت اور نیند کے خمار میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس گھنی خاموشی میں صنم پلکیت ہولے ہولے، دبے پاؤں، سفیدے کی ایک نازک سی ٹہنی ہاتھ میں اُٹھائے، اِدھر اُدھر دیکھتی جارہی تھی۔ سرد ہوا کے تیز تیز جھونکوں میں اس کا ابھرا ہوا شباب اور نکھرا ہوا حسن اور بھی دمک اٹھا تھا۔ اس کی ایڑیوں تک لٹکی ہوئی سیاہ چوٹی جھوم جھوم کر برسات کی کالی بدلیوں کی طرح لہرا رہی تھی۔ آسمان پر چتکبرے ابرپارے پھریریاں لے رہے تھے۔ چودھویں رات کا نور سے لبریز چاند جلدی جلدی بادلوں کی اوٹ میں جارہا تھا------ جیسے وہ چے چے کی بھرپور دوشیزہ کے سامنے شرما رہا ہو۔

صنم پلکیت کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک دھیما سا نغمہ ناچ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی تان سوئی ہوئی ندی کے پُرسکون گیت کی طرح ہوا میں منتشر ہو کر گم ہو جاتی تھی۔ معبدِ بیوس میں ابھی تک روشنی نظر آرہی تھی۔ اس کے بند دروازوں سے موسمِ بہار کی ننھی ننھی پھوار کی طرح، پجاری کی پُرسوز، لرزتی ہوئی آواز پھوٹ کر فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ صنم پلکیت نے ایک لمحہ ساکت کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے، اور پھر معبد کے ساتھ والے حجرے میں چلی گئی۔ حجرے میں ایک مدھم سا دیا ہولے ہولے دم توڑ رہا تھا۔ معبدِ بیوس کے بوڑھے پجاری کی رفیقۂ حیات، کلزانگ ڈولما دو تین نمدے اوڑھے مدہوش سو رہی تھی۔ صنم پلکیت نے بجھتے ہوئے چراغ میں

مکھن ڈال کر اُسے تازہ زندگی بخشی، اور پھر کلزانگ ڈولما کو آہستہ سے ہلا کر جگایا۔

"ماں، ------ مقدس ماں------"

"تم؟ صنم پلکیت؟" بڑھیا اپنی خوابیدہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

نوخیز حسینہ کا سینہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اور اس کی وحشی آنکھوں میں ایک عجب سی بے قراری تھی۔ کلزانگ مسکرانے لگی۔ "اچھا ہوا بہت اچھا ہوا------ چے چے پر چمکنے والے تاروں کی قسم، مجھے معلوم تھا کہ تم کسی رات ضرور مجھے جگاؤ گی------ مجھے معلوم------"

"ماں، ------ مقدس ماں------" صنم پلکیت پجارن کے کندھے پر سر رکھے کپکپا رہی تھی۔ اس کی مست مست، تیرتی ہوئی آنکھوں کی وحشت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔

"مجھے معلوم تھا------ چے چے پر برسنے والے بادلوں کی قسم------" کلزانگ اپنی دھن میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے معلوم تھا------ نوجوان لڑکیاں ضرور گھبراتی ہیں۔ احمق چھوکریاں! خواب سے بے تاب ہو جاتی ہیں------ ہی ہی ہی------ بیٹی تیرے شباب کی راتیں محبت کے تاروں سے ٹمٹمائیں، مجھے بتا تو سہی مقدس لھانے تجھے کس خواب کی عروس بنایا ہے؟"

"ماں میرے دل میں میٹھی میٹھی خوشی تڑپتی ہے، جیسے------"

"مجھے معلوم ہے------ سب کچھ معلوم ہے------ لیکن وہ خواب کیا ہے بیٹی؟"

صنم پلکیت نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہانپتے ہوئے سینے کو سنبھالا۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں، رُک رُک کر، رازدارانہ لہجے میں اپنا خواب سنایا------ یہ وہ خواب تھا جس کی جھنجھوڑ تبت کی معصوم دوشیزاؤں میں جوانی کا پہلا احساس جگاتی ہے۔ عمر کے پندرھویں سال تک خداوند لھا ہر لڑکی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دل کو جنسی محبت کے آتشیں جذبات سے خالی رکھتا ہے۔ اس عمر کے بعد جب بڑھتی ہوئی دوشیزہ کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تیز ہونے لگتی ہے، اور اس کی رگوں کا خون تازہ حرارتوں سے گرمانے لگتا ہے۔ تو ایک لطیف رات، جبکہ چودھویں کا چاند سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتا ہے، خداوند لہا کسی تمثیلی خواب کے ذریعے اس کی جوانی کی لہروں کو متلاطم کر دیتا ہے۔ نودمیدہ دوشیزہ کے لئے یہ سہاگ کی پہلی رات ہوتی ہے۔ کیونکہ اس شب، خداوند لہا کے حکم سے، وہ خواب میں کسی فوق الفطرت روحانی طاقت کی عروس بنتی ہے------ لیکن صنم پلکیت کا خواب سن کر بوڑھی کلزانگ ڈولا کچھ افسردہ ہو گئی۔ کیونکہ صنم پلکیت کے خواب میں جو دولہا آسمان سے اُترا، وہ مضطرب لہروں کی طرح کوئی ضیاپاش تجلّی نہ تھی۔ بلکہ ایک حسین، بیحد حسین، نوجوان تھا۔ جس کا کشادہ سینہ گرتی ہوئی آبشار کی شفاف آبی چادر کی طرح خوبصورت تھا جس کی پیشانی چودھویں کے چاند سے بھی پُرنور تھی۔ صنم پلکیت کے شرمائے ہوئے گالوں پر اس نوجوان نے گرم گرم بوسوں کا مینہ برسایا۔ اور پھر اس کی لہراتی ہوئی چوٹی کو اپنی گردن میں ڈال کر ناچنے لگا------ لیکن جب بادلوں کے فرش پر، بجلی کے تاروں سے بنی ہوئی عروسی سیج عشق بیتاب کو حسن کی سکوں پرور چاندنی میں سلانے والی تھی۔ تو آہ! وہ دلربا نوجوان پلکیت کے پہلو سے غائب ہو گیا------ "ماں، جس طرح چاند کی کرن بادلوں میں کھو جائے------ مقدس ماں! جیسے پانی کی لہر مچل کر مٹ جائے، اور------ اور پھر نہ ملے۔"

کلزانگ ڈولما دونوں ہاتھوں سے اپنا کپکپاتا ہوا سر تھامے متفکرانہ سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔ کمرے کا چراغ پھر اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا------ اور صنم پلکیت کے لمبے لمبے بے قرار سانس میں لپٹی ہوئی ایک دھیمی سی آواز کہہ رہی تھی------ "معبد ہیموس کی اچھی ماں! یہ میٹھی میٹھی خلش کیا ہے؟ جس طرح ننھی ننھی بوندیں تالاب میں گر کر بلبلوں کی ہلکی ہلکی لہریں بناتی ہوں------

"تم جا کر سو جاؤ بیٹی،" آخر کار ڈولما نے صنم پلکیت کی طرف حسرت آمیز نگہ سے دیکھتے ہوئے کہا------ "گھر جا کر سو جاؤ------ دو روز کے بعد گونپہ ماٹھو کا نغزانگ ہو گا۔ وہاں جا کر مقدس لہا سے پوچھنا کہ تمہارا خوبصورت نوجوان کہاں ہے------"

گونپہ ماٹھو کا سالانہ میلہ نغزانگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس روز تین ریاضت اور چلّہ کش عاملوں پر لہا یعنی دیوتا کا ظہور ہوتا ہے۔ اور وہ زائرین کے سوالوں کا جواب دیتے اور ان کی مرادوں کا نتیجہ بتاتے ہیں------

گونپہ کے دروازے کے سامنے ایک کھلا صحن تھا جس میں برآمدے بنے ہوئے تھے۔ ایک برآمدہ میں کوشوک (گونپہ کے سب سے بڑے لامہ کا لقب) اور دوسرے لامہ درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ڈھول، تُرہی، جھانجھ اور سرنائی بجانے والے لامہ قطار در قطار بیٹھے تھے۔ پوستینوں اور چوغوں میں لپٹے ہوئے زائرین کا ہجوم، گردن جھکائے، خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔ لیکن زنانہ برآمدے میں دھیمی دھیمی باتوں کا ہلکا سا شور ہو رہا تھا۔ ضعیف العمر، بوڑھی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں، اپنی اپنی لڑکیاں، اپنی اپنی مرادوں کو سینے میں چھپائے لہا کے ظہور کے لئے بے تاب تھیں۔ کالے رنگ کی خوشنما پیشوازوں کے اوپر انہوں نے بکری کا چرا، بالوں کو اندر کی طرف رکھ کر، اوڑھا ہوا تھا۔ ان کے سر پر قسم قسم کے پیراک نئی بہار دکھا رہے تھے۔ پیراکوں میں چاندی سونے کے زیورات اور فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی نوک پیشانی کے اوپر تھی۔ اور یہاں سے، کانوں سے لپٹی ہوئی پیٹھ تک چلی جاتی تھی------ لیکن صنم پلکیت کے سر پر کوئی پیراک نہ تھا------ ایک جوان حسینہ کا اس ضروری زیور کے بغیر برسرِ عام آنا اور جذبات کی شدت سے ہانپ ہانپ کر، وحشیانہ آنکھوں سے مردوں کے مجمع کی طرف دیکھنا سب کی نفرت اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعجب کا مرکز بنا ہوا تھا------ نوجوان لڑکیاں، جن کا سجایا اور سنوارا ہوا حسن صنم پلکیت کے پریشان پرتو کے سامنے خود بخود شرما رہا تھا، حاسدانہ سرگوشیوں میں من گھڑت افسانے سنا رہی تھیں، کہ کس طرح پندرہ سال پورا ہونے سے پہلے صنم پلکیت نے، چپے چپے کے آوارہ اور بدچلن نوجوانوں کی مدد سے خداوند لھا کے حکم کے بغیر، اپنی جوانی کو جگایا------ اور جھیل ٹانچی کا نمک میرے لئے تلخ ہوجائے۔ "ایک زرد زرد آنکھوں والی، بھدی سی لڑکی نے قسم کھاتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک تاریک شب میں نے صنم پلکیت کو روپشو کے کنارے، اپنو خسفرول کی گود میں نہ دیکھا ہو------

گانے والے لاموں کی تھرتھراتی ہوئی کمزور آواز ساز کی جھنجناتی ہوئی تانوں میں ہم آغوش ہو کر وجدانی سرور پیدا کر رہی تھی۔ اور ایک مغلوب الوجدان لامب بیخودی کے عالم میں جھوم جھوم کر تڑپ تڑپ کر، زمین سے سر پھوڑ رہا تھا------ یکایک گونپہ کے دروازے کو جنبش ہوئی، اور اندر سے تین چلہ کش عامل ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے میں ننگی تلوار اٹھائے ناچتے ہوئے نکل آئے۔ ان میں لھا کا ظہور ہو چکا تھا، اور زائرین کا ہجوم ایک بے اختیار نعرۂ مسرت مار کر عقیدت سے سر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا------ چلہ کشوں نے پہلے صحن میں باجے کی تال پر دیوانہ وار رقص کیا۔ اور پھر اچھلتے ہوئے گونپے کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ وہاں سے کود پھاند کر وہ آس پاس کی دیواروں پر دوڑتے پھرے۔ اور پھر زائرین کے ہجوم میں آ گئے------ اب سوالوں اور جوابوں کا ایک تانتا سا لگ گیا۔ اور حاجت مند جھک جھک کر، ادب سے اپنی مرادیں پوچھنے لگے------ صنم پلکیت خاموش اور ساکن ایک طرف کھڑی رہی۔ اور جب ایک ریاضت کش نے اس کے پاس آ کر اپنی تلوار کو نیزے کے ساتھ ٹکرایا۔ تو اس نے جھک کر ہچکچاتے ہوئے پوچھا------

"مقدس لھا، میرا خوبصورت نوجوان کہاں ہے؟"

"تمہارے پہلو میں"------ اور عامل وہاں سے بھاگ گیا۔

یکے بعد دیگرے تینوں چلہ کش صنم پلکیت کو یہی جواب دیتے گئے لیکن اس کی پریشانی کو بالکل سکون حاصل نہ ہوا۔ اور نہ ہی اس کے سینے کی میٹھی میٹھی گدگدیاں ختم ہوئیں------ شام کی ترچھی شعاعوں میں، جبکہ ڈوبتے ہوئے آفتاب کا لال لال سینہ ناکام محبت کے زخمی دل کی طرح خون میں ڈوبا ہوا تھا، گونپہ ماٹھو کے زائرین ایک ایک کر کے، شفق صبح کے ستاروں کی طرح رخصت ہو رہے تھے۔ لیکن صنم پلکیت اپنی ہرن جیسی بے قرار آنکھیں بند کئے، دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے، اپنی جگہ کھڑی تھی۔ رات کے اندھیرے میں لھا کے تینوں چلہ کش پھر وہاں آئے، اور ساکن وجامد حسینہ کی چوٹی کو پکڑ کر بہت دیر تک رقص کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ کچھ پڑھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے------

تین دن تک صنم پلکیت کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ گونپہ ماٹھو کے لاماؤں نے ہزار جتن کئے لیکن اس مجسمے کو حرکت نہ ہوئی------ چوتھی رات، جب سہما ہوا چاند، بادلوں کی اوٹ سے صنم پلکیت پر اپنی تھرتھراتی ہوئی کرنیں نچھاور کر رہا تھا۔ تو یکایک صنم کے پہلو میں کچھ جنبش سی ہوئی۔ اور------ ایک حسین نوجوان بے حد حسین، جس کا کشادہ سینہ آبشار کی بہتی ہوئی چادر سے بھی خوبصورت تھا، ہوا کے پردے پر نمودار ہوا------ نوجوان نے مسرت کے خمار سے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے بے تابانہ صنم پلکیت کی طرف دیکھا------ اور تڑپ کر اسے آغوش میں اٹھا لیا------ لیکن صنم پلکیت فقط ایک پتھر کا مجسمہ تھی، جس کی سُرخ سفید سطح دھند کی وجہ سے نم آلود اور برف کی طرح سرد ہو رہی تھی------

چپے چپے کی آبادی حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی------ صنم پلکیت کا پتھر بن جانا اور ایک روحانی نوجوان کا رات دن اس کے سامنے رقص کرتے رہنا------ یہ کیا تھا؟ بوڑھی کلزانگ ڈولما خود بھی حیران تھی۔ لیکن معبد ہیوس کے پجاری کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے کچھ معلوم تھا!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"------ یہ سب ضد ہے" وہ اپنا کانپتا ہوا سر ہلا کر پُراسرار لہجے میں کہا کرتی تھی------ "سب ضد کا نتیجہ------ ہی ہی ہی------ خداوند لھا سے ضد! جب تک روحانی نوجوان نے ضد کی کہ وہ صنم ہلکیت کے حسن کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنا کر لے، اس وقت تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں تشنہ کام و تشنہ روح تڑپتا رہا------ ہی ہی ہی------ اور جب صنم ہلکیت نے ضد کی کہ اس کے پہلو والا خوبصورت جوان اسے مل جائے، تو وہ پتھر بن گئی، اور روحانی جوان انسان بن گیا------ ضد؟ بیوقوف لڑکی------ مجھے معلوم تھا------ معبدِ ہیوس میں جلنے والے چراغ کے کھن کی قسم------ آسمان سے ضد؟

سٹینو گرافر

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔

"میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤں کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے!
وہ میرے شبنم کے موتی چرا رہا ہے!"

ٹائپ کئے ہوئے کاغذوں کے پلندے میں شاید وہ اپنا پرائیویٹ نوٹ پیپر رکھ کے بھول گئی تھی۔ میں نے میز کی گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔

"دیکھو گریسی، یہ شاید تمہارا کاغذ ہے۔"

"یس سر" وہ جھجکی، اور پھر اس کا گلا بھر آیا۔ جیسے میں نے اس کی ٹائپنگ میں ہزاروں غلطیاں پکڑلی ہوں۔ "سوری سر۔ میری بھول سے دوسرے کاغذوں میں چلا آیا ہے۔"

"جب تمہاری غزل پوری ہو جائے مس، تو مجھے دکھانا!" میں نے مذاقاً کہا۔

اس نے ٹرے کی فائلوں کو اکٹھا کیا اور جلدی سے نکل گئی۔

اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی۔

صبح صبح میں نے کئی ضروری سرکلر لکھائے تھے۔ وہ شام تک ٹائپ کر کے نہ لائی۔

میں نے بلا کر پوچھا "سب کاغذ ضروری ہیں مس۔ ابھی ختم نہیں ہوئے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سوری سر۔ میں فوراً لاتی ہوں" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"اور غزل؟" میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طنز سے اس کے دل پر چرکا سا لگا۔ غالباً وہ اس اچانک چوٹ کے لئے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی ساری ٹائپ شدہ فائلیں لے آیا۔

عموماً مجھے اس بھولی سی لڑکی پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے بل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فراک پہن کر دفتر آیا کرتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس روم کی عادتوں کا پرتو تھا۔ سکول کی لڑکیوں میں جو الھڑ سی بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی اس کو فائلوں کے انبار نے پامال نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامر کی غلطی کی۔ گریسی نے ٹوک دیا۔

"دونوں طرح ٹھیک ہے" میں نے اپنی پوزیشن کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

"نہیں، سر۔ نیلسن کی ہائی سکول گرامر میں اسے غلط ٹھہرایا گیا ہے"

میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے ٹائپ کئے ہوئے پلندوں میں املا کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کر لیتی، تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کاغذوں کے ڈھیر میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سنجیدہ سے بچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنا دیئے ہوں وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دو چار دفعہ اتفاقاً اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر کئی بار اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا۔ اس نے پنسل اٹھا دی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔

"کیا بات ہے مس؟" میں نے پوچھا۔

کچھ نہیں سر۔ مجھے کنگ بروس اور مکڑی کا قصہ یاد آگیا تھا"

چوٹ برجستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور برے لگے۔ لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے۔ کیونکہ اس کا گول گول چہرا اسفنج کی طرح تھا جس میں جذبات کے پرنالے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر جذب ہو جائیں۔

دوسری بار جب میں نے اسے ہنستے دیکھا تو نازک موقعہ تھا۔ اس روز دفتر کی ایک لیڈی اسسٹنٹ مس مارگرٹ نے دو ماہ کی چھٹی کے لئے درخواست بھیجی تھی۔ کلرکوں میں کانا پھوسی ہو رہی تھی، اور وہ اپنے سکشن کی ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لڑکیاں جھوٹ موٹ ٹائپ کی مشینوں پر انگلیاں مار کے ایک بھدا سا ترنم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مارگرٹ کی افسوسناک مجبوریوں پر زیر لب تبصرہ ہو رہا تھا۔ گریسی نہ مسکراہٹوں میں شامل تھی، نہ چہ میگوئیوں میں۔ وہ حسب معمول کاغذوں کا پلندہ لئے کھٹ کھٹ ٹائپ کر رہی تھی۔

"بدمعاش!" دفتر کے ہیڈ اسسٹنٹ امیش بابو نے مارگرٹ کی درخواست پر سفارشی نوٹ لکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اینگلو انڈین چھوکریاں آگا پیچھا تو دیکھتی نہیں، اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باوا کا گھر ہوا۔ کس نے کہا تھا کہ سالے ٹامیوں کے ساتھ رات دن رکشا میں گھوما کرو۔ امیش بابو نے قلم کان میں گھما کر کچھ ایسی ادا سے کہا۔ جیسے ٹامیوں کی بجائے اگر مارگرٹ اس کے ساتھ رکشا میں گھومتی، تو گویا محفوظ تھی۔

پھر امیش بابو نے کھسیانی بلی کی طرح کن انکھیوں سے گریسی کی طرف دیکھا اور آواز میں لوچ پیدا کر کے بولے۔ "مس گریسی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر مارگرٹ کے لئے صرف ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کردوں تو کام چل جائے گا نا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گریسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ------ ٹائپ مشین چل رہی تھی۔

"مغرور ہے سالی" امیش بابو جل کر بولے۔ پھر انہوں نے ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ "دیکھ لوں گا جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی"

لڑکیوں نے امیش بابو کی خوشامد کے طور پر ہلکے ہلکے قہقہے لگائے۔

گریسی کا منہ تمتما گیا۔ اس نے دھک سے ٹائپ مشین پرے دھکیل دی۔ اور اپنی فائلوں کا پلندا اُٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ دفعتاً کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈنشل فائلوں کے ٹکڑے دیکھ کر سارے کلرک سہم سے گئے۔ امیش بابو کان میں قلم گھماتے میرے کمرے میں آئے۔ میں نے گریسی کو بلا کر پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "سوری سر۔ مجھے غصہ آ گیا تھا"

غصہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت ہنسی آئی۔ امیش بابو کھسیانے ہو گئے۔ اگلے روز میں نے کئی کلرکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز سٹینو گرافر کی اسامی کے لئے انٹرویو ہونا تھا۔ بہت سی لڑکیاں امیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چہروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی ساڑھیوں اور گاؤنوں میں سلیقے کے بل تھے، جن کے سہارے کمر اور سینے کے خطوط والہانہ طور پر عریاں ہو رہے تھے۔ گریسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فراک پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینئر کیمبرج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انٹرویو کے وقت لڑکیاں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر سوال پر انکے ہونٹوں کی گلابی پتیاں ایک لطیف سی مسکراہٹ کو شگفتہ کرتیں، ان کی گردنوں میں ہلکے ہلکے خم اٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں کو اکٹھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو پیانوں میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق ڈانسر تھی۔ ایک نے موسیقی کے تمغے جیتے تھے۔ دوسری تیرنا بہت خوب جانتی تھی۔ جب گریسی کی باری آئی تو

بورڈ کے صدر نے کوالی فیکیشن والا سوال دہرایا۔

"سر شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کرنا جانتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

"اور؟" بورڈ کے ایک ممبر نے کریدا۔

"سر، شارٹ ہینڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں۔ لیکن میں مشق کر رہی ہوں

"اور کچھ؟" دوسرے ممبر نے زور دیا۔

"سر، آپ کو شاید سٹینو گرافر کی ضرورت ہے" گریسی نے یاد دلایا۔

تڑاخ!------ انٹرویو بورڈ کے ممبر گویا ایک دھماکے کے ساتھ پیانو، اور ناچ، اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آ گرے! معاً انہیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کان کھینچ دیئے ہیں۔ انکی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدہ سا جھٹکا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انہوں نے گریسی کو رکھ لیا۔

جب گانے اور ناچنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک ننھی سی نیلے فراک والی چھوکری ان پر بازی لے گئی ہے، تو ان کی گردنوں کے لوچ نکل گئے ہونٹوں کی گلابی پتیاں بدنما طور پر بکھر گئیں اور انہوں نے ناک سکیڑ کر سوچا۔ آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پچانیں، بوڑھے، کھوسٹ------

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی، تو امیش بابو سب سے اوّل چیل کی طرح اس پر جھپٹے۔ جس طرح ہر نئی چھٹی کے اوپر والے بائیں کونے پر ان کا چھوٹا سا دستخط ہونا ضروری تھا، اسی طرح ہر نئی ٹائپسٹ لڑکی پر سب سے پہلے جھپٹنا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پینتالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال گر گئے تھے۔ لیکن ان کا ایمان تھا۔ کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سرکار کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر مکمل بھروسہ ہے، تو ان سالی چھوکریوں کے ناک بھوں چڑھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو رشوت اور عورت ایک برابر ہیں------

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور یہ اینگلو انڈین لڑکیاں تو ہاتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل------ چلتی کا نام گاڑی ہے بھائی، روپیہ ہو، تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو امیش چندر ہر مہینے اپنی بالائی آمدنی کا ایک حصّہ اس ہاتھ کے میل کے لئے اُٹھا رکھتے تھے------یوں بھی ان کے ہاتھ میں زنجیر کے دونوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکولا بھی لگے، تو لڑکیوں کی ترقی کے پروانے امیش بابو کی لوہے کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ انکی چھٹی کی درخواستیں درازوں میں پڑی پڑی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تنخواہوں کے بِل میں غیر حاضریوں کے سُرخ سُرخ نشان نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں پہلی بار امیش بابو کو محسوس ہوا، کہ ان کی گاڑی کے پہیے کے سامنے ایک بڑا سا روڑا آ پڑا ہے اس لئے وہ گریسی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ وہ جب ان کے سامنے آتی۔ تو ان کے مُنہ کے بائیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر بہنے لگتی۔ اور ان کے مصنوعی دانتوں کا جبڑا انگوروں کی ترشی کو بڑی شدّت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راہب خانہ ہوا! ------ امیش بابو عموماً جھلایا کرتے تھے۔ گریسی کے آنے سے ٹائپنگ سیکشن پر سنجیدگی کا موٹا سا لحاف گر جاتا تھا۔ جس طرح آدھی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گرجے کا پادری ہاتھ میں انجیل اُٹھائے آکھڑا ہو------! اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی سوئیاں ۱۲ سے ۱۲ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سوئیاں کہنا بھی غلط ہے، کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھٹکوں میں تو زندگی کے پُراسرار لمحے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گریسی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی، جسے ہر صبح دھوپ میں سکھانے کے لئے کھڑکی پر ڈال دیا جائے------ اور وہ شام تک لٹکی رہے------دفتر میں جو اور ٹائپسٹ لڑکیاں تھیں------ ان کی زندگی میں رنگین چور دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ تھے، خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریسی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی تھی۔ کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی سِلیں رکھ کر مسدود

کر دیا ہو۔ دن کے ایک بجے جب لنچ کے لئے گھنٹے بھر کی رخصت ہوتی، تو ریفرشمنٹ روم کی بلوری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کئی کئی پروانے جمع ہو جاتے۔ امیش چندر اور ان کے ہم خیال بابو اس موقعہ پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کبابوں، مرغ مسلّم اور بیئر کی رنگین بوتلوں کی شکل میں اتار پھینکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ لڑکیاں، اور لیڈی کلرکیں واپس لوٹتیں، تو ان کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری بھاری ہو کر گرنے لگتے اور بیئر کا خمار لوریاں بن کر انہیں تھپکنے لگتا۔ امیش بابو کو بھی اس وقت گریسی کے ٹائپ رائٹر پر غصّہ آتا تھا، کیونکہ اس کی ٹِک ٹِک اس ماحول کی خاموش موسیقی میں نامانوس گڑگڑاہٹیں پیدا کرتی تھی۔ گریسی کی میز کی دراز میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا رہتا تھا، جس میں وہ اپنے لنچ کے لئے چار چھوٹے سے سینڈ وچ باندھ لایا کرتی تھی۔ جب شام کے پانچ بجتے تو وہ بچی ہوئی فائلوں کا بنڈل اُٹھا کر سائیکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤں۔ لیکن کچھ بات تھی، کہ میری ہمت نہ بندھی جب دوسری لڑکیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتاقانِ یار کا غول ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ کچھ خاکی وردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کمپنیوں اور دفتروں میں کام کرنے والے اینگلو انڈین چھوکرے! کبھی کبھی ہوٹلوں کے گائڈ اور رقص گاہوں کے دلّال بھی اپنا پھندا اُٹھائے پہنچ جاتے تھے۔ کسی لڑکی کو رکشا میں جگہ ملتی، کوئی وکٹوریہ میں سوار ہو جاتی، کسی کے لئے ٹیکسی منتظر ہوتی------ اور پھر ان کی شام کا آغاز فرپوز میں چائے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس، اور وسکی کے چھچھاتے ہوئے پیگ جذبات کا انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پُراسرار سائے------ لیکن گریسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھا۔ جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چورنگی سے گزر جاتی۔ نیو مارکیٹ سے چاکلیٹ یا ٹافی کا ایک پیکٹ خریدتی۔ اور پھر گوراچند روڈ پر اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ جارج تھا------ ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ستم ظریفیوں نے گریسی کی امانت میں دیدیا تھا۔ جب جارج بغل میں کتابوں کا بقچہ اٹھائے سکول سے لوٹتا۔ تو گریسی کے لئے گویا زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہوتا تھا۔ وہ ننھی سی لڑکی اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ جارج کے قدموں میں بچھا دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھولی میں ڈال دیتی۔ گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھندلے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا باپ کلکتہ کی ایک اسٹیمر کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سا یاد تھا کہ عام طور پر آدھی رات گئے ایک بدمست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چُور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لیکر یوں جھنجھوڑنے لگتا جیسے بھوکا کُتا ہڈیاں چچوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شوربے اور گوشت کی پلیٹوں کو اندھا دھند بیچاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو بھی پیٹا تھا۔ یونہی، بلا وجہ۔ اور گریسی کو اب تک یاد تھا کہ اس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پیلی پیلی دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سرخی اور پاؤڈر کے بدنما دھبے، بکھرے ہوئے بال، بانہوں پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں------ ایک دفعہ ایک ایسی ہی سُرخ بالوں والی بدصورت سی لڑکی کئی روز ان کے گھر میں ٹھہری۔ اور جب جانے لگی، گریسی کے باپ نے گھر کے کپڑے، برتن اور زیور اُٹھا کے ٹیکسی میں ڈال دیئے، اور اس سُرخ بالوں والی لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر چلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں اُمید کا چراغ جلائے بیٹھی تھی کہ شاید کسی روز آدھی رات گئے ایک بدمست شرابی گھر میں آئے اور اس کی ہڈیاں چچوڑ کر رکھ دے۔ اس بیچاری کا سر پلیٹوں کی چوٹ سہنے کے لئے ترس گیا لیکن جو ٹیکسی جا چکی تھی، وہ واپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھولی میں گریسی اور جارج دو نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی، اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں امانتوں کو سنبھالا۔ ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی، تو

ایک گذرتی ہوئی ٹرام نے اچانک اُسے کچل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک چاکولیٹ کے دو پیکٹ تھے، جو وہ ہر شام گریسی اور جارج کے لئے خرید کر لے جایا کرتی تھی------

خدا جانے وہ کونسا ازلی انصاف تھا جس نے یکایک گریسی کو سکول کے کمرے سے نوچ کر دفتر کی میز پر لا بٹھایا۔ وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن جارج کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہوں کو سمیٹ کر بند کر لیا۔ دفتر سے آتے ہوئے وہ ہر روز جارج کے لئے چاکلیٹ یا ٹافی کا بنڈل لایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فراک تھے۔ لیکن جارج کے لئے وہ ہر فیشن کے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔ اتوار کے اتوار وہ اسے پک نک پر لے جاتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے وہ سینما چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ملازم نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنوں اور سمندری ڈاکوؤں کی کہانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گریسی دفتر کی بچی ہوئی فائلیں ٹائپ کرنے بیٹھ جاتی------ زندگی کی اس انتھک گردش میں شاید ایسے لمحے بھی ہوتے تھے، جو اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے، اور وہ کسی دبے پاؤں آنے والے چور سے شبنم کے موتی چھپا لیتی تھی۔

گریسی اب بھی سٹینو گرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاس بہت سے بھڑکیلے فراک ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی------ اسے بھی رکشا میں جگہ ملتی ہے یا وکٹوریہ میں یا کسی شاندار ٹیکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فیروز کی چاٹ ہے۔ لائٹ ہاؤس سینما۔ گریٹ ایسٹرن میں ڈنر۔ ڈانس وسکی کے چھچھاتے ہوئے پیگ۔ جذبات کے انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پُراسرار سائے------ جارج بھی سیانا ہو گیا ہے۔ وہ آدھی آدھی رات گئے نشے میں چُور گھر آتا ہے۔ اور غصے سے بے تاب ہو کر شوربے اور گوشت کی پلیٹیں گریسی کے سر پر دے مارتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی آنکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ پیلے پیلے گال۔ نیلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رگیں الجھے ہوئے بال------ گریسی کے دل میں پیہم ایک زہرناک خدشہ لرزتا ہے کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال بنتی رہتی ہے۔ تاکہ جارج اڑ نہ جائے۔ جارج کو روپیہ چاہیئے۔ شراب کے لئے روپیہ۔ سیر کے لئے روپیہ شکار کے لئے روپیہ۔ سُرخ بالوں والی بھدی لڑکیوں کے لئے روپیہ------ گریسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ لاتی ہے۔ وہ روپیہ کماتی ہے۔ وہ روپیہ چراتی ہے------ دفتر کی تنخواہ سے، صاحب کے تحفوں سے، امیش بابو کے ہاتھ کے میل سے، فریوز سے، لائٹ ہاؤس سے، گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے------

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پرور آبشار میں یہ جوار بھاٹا کیسے آیا۔ برسوں سے وہاں میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ چارج دینے سے پہلے میں نے نئے صاحب کو دفتر کے عملے سے ملایا۔ جب گریسی کی باری آئی، تو انہوں نے چپکے سے میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچا، اور زیرِ لب گنگنائے------ گڈ لارڈ پٹاخہ ہے، بھئی پٹاخہ" اس وقت میرے دل میں دفعتاً یہ خواہش ابھری، کہ کاش دفتر کی چھت پر ایک زبردست بم کا گولہ پھٹ جائے------ جب میں ریل گاڑی میں سوار ہوا، تو دفتر کا سارا اسٹاف الوداع کہنے آیا ہوا تھا ان میں گریسی نہ تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی، کیونکہ میں سمجھتا تھا، کہ اس کے دل میں ضرور میرا احترام ہے------ لیکن جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر جا رُکی، تو میں نے دیکھا کہ وہ پلیٹ فارم پر پھولوں کی چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے کھڑی ہے۔ جب اس نے پھولوں کا گلدستہ مجھے دیا، تو اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ننھے ننھے خطروں کا طوفان سا اُمڈا ہوا تھا۔ وہ بار بار کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیتی تھی۔ میں نے اُسے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک چھوٹا سا لیکچر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح تھرتھرا اٹھے، جیسے آندھی کے تھپیڑوں نے انہیں اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔

"سر۔ میں کمزور نہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم سا خوف سمایا جا رہا ہے۔ سر، مجھے نہیں معلوم کہ میرا دل اس قدر ڈوب کیوں رہا ہے سر------" وہ اس سہمے ہوئے بچّے کی طرح میرے قریب کھسکتی آ رہی تھی، جسے ایک گہری اور تاریک کھائی کے سرے پر بے یارو مددگار چھوڑ دیا ہو------

جب گاڑی چلنے لگی، تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ گریسی نے میرا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی پلکوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور تڑپ کر میرے ہاتھ پر گر پڑے------ دو جلتے ہوئے انگارے جو ازل تک اپنے خاموش داغ چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گریسی کے سپنوں کے خواب بھی اجڑ گئے، اس کے شبنم کے موتی بھی لٹ گئے، وہ جیتے جی مر بھی گئی------ لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھین سکتا ہے، جو میرے دائیں ہاتھ کی رگ رگ میں پیوستہ ہیں؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com